راوی فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام مسلسل اشاعت کا 20 واں سال

Monthly

Arxang

Lahore

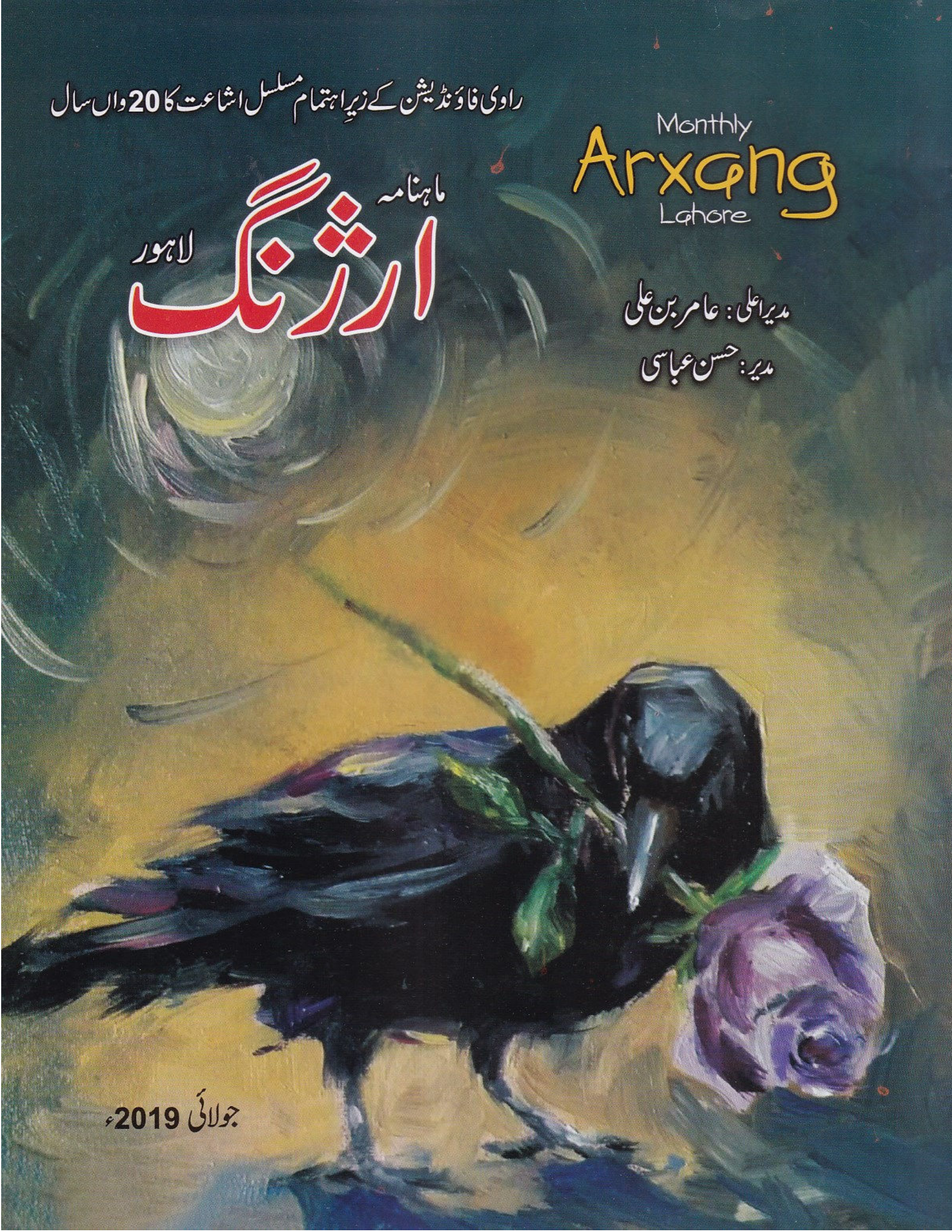
ماہنامہ

ارژنگ

لاہور

مدیر اعلیٰ: عامر بن علی

مدیر: حسن عباسی



جولائی 2019ء

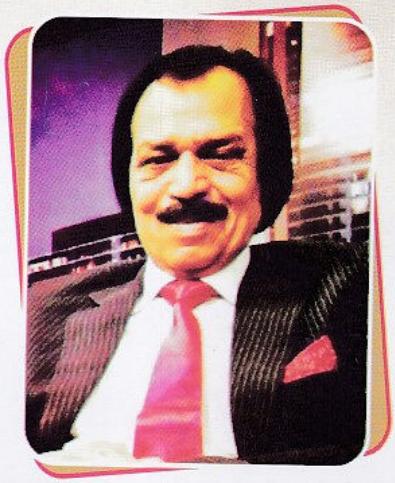
اچھا تخلیق کار وہ ہے جس کی تحریر آنکھ کے ذریعے دل میں اترے: اعتبار ساجد



ہماری ادبی فضا میں 90 کی دہائی کے بعد فضائی آلودگی بڑھنے لگی

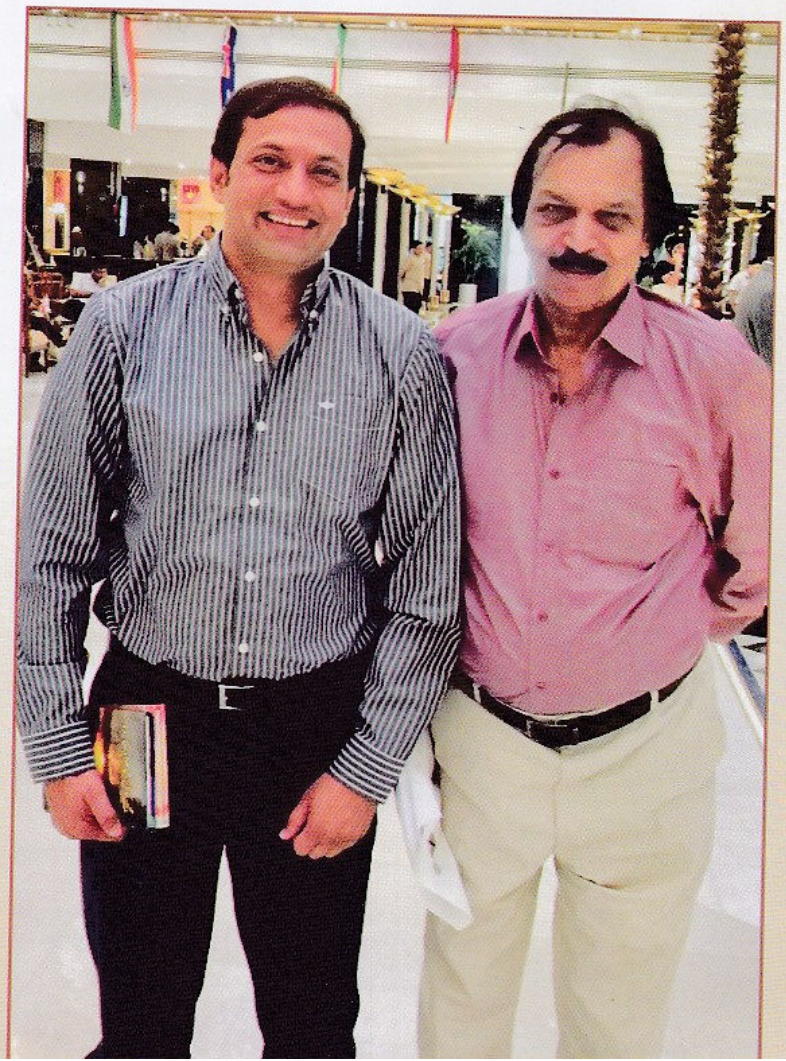
پاکستان کے نامور ادیب، شاعر، کالم نگار اور ماہر تعلیم **اعتبار ساجد** سے **عامر بن علی** کی گفتگو

اعتبار ساجد پاکستان کے نامور شاعر، ادیب اور دانشور ہیں۔ 60 سے زائد کتبِ نظم و نثر کے خالق ہیں۔ پیدائش اور ابتدائی تعلیم ملتان، بعدازاں بلوچستان، پھر اسلام آباد اور اب لاہور میں مقیم ہیں۔ تعلق سادات گھرانے سے ہے۔ انہوں نے خاصا نثری کام کیا لیکن شہرت شاعری سے پائی اور ایسی پائی کہ ساری اردو دنیا ان کی معترف ہوگئی۔ ان کی ایک ایک کتاب کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ بالخصوص ''مجھے کوئی شام ادھار دو'' کو اتنی پذیرائی حاصل ہوئی کہ پے در پے اس کے ایڈیشن دھڑا دھڑ شائع ہوتے گئے۔ حال ہی میں اس کتاب کا 18 واں ایڈیشن شائع ہوا ہے۔



ارژنگ: سب سے پہلے اپنے ادبی و سوانحی پس منظر سے آگاہی دیجیے۔

اعتبار ساجد: 1963ء کی دہائی میں باقاعدہ لکھنے اور چھپنے کا آغاز ملتان سے کیا۔ متعدد عمومی اور پاکستان کے مؤقر جریدے ''افکار، کراچی، نقاد، نقش اور عکس لطیف'' کراچی کے علاوہ ہفت روزہ ''قندیل'' لاہور میں بھی ہفتہ وار کالم ''چہرے'' کے عنوان سے لکھتے رہے۔ ملتان میں ہونے والے ان تمام کل پاکستان مشاعروں اور محافل میں شریک ہوئے جن میں برصغیر کے نامور شعرا اور ادباء شامل ہوتے تھے۔ مثلاً جوش ملیح آبادی، احسان دانش، فیض احمد فیض اور بے شمار ایسے نامور لوگ جواب اس دنیا میں نہیں رہے۔ تب فضا میں ایسی آلودگی، ایسی کثافت اور ایسی آپا دھاپی نہیں تھی۔ وہ زمانہ برق رفتار نہیں، آہستہ رو تھا لیکن برصغیر میں جتنے بڑے ادیب و شاعر پیدا ہوئے وہ 60,50 اور 70ء کی دہائی میں پیدا ہوئے۔ 80ء کی دہائی میں بھی یہ سلسلہ جیسے تیسے جاری رہا۔ البتہ 90ء کی دہائی کے بعد فضائی آلودگی بڑھنے لگی۔ جب کام کی جگہ نام کی خواہش پروان چڑھنے لگے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔



ارژنگ: ادب سے شوق کی ابتدا؟

اعتبار ساجد: ادب سے شوق کی ابتدا تو اوائل عمری ہی میں ہو چکی تھی۔ بعد میں تو محنت اور ریاضت تھی یا ان بزرگوں کی صحبت جن سے بہت کچھ سیکھنے اور سمجھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ جوں جوں عمر آگے بڑھی مطالعے کے شوق میں بھی شدت پیدا ہوئی۔ اب تک ہم مطالعے کے بغیر سو نہیں سکتے۔ یہ ضرور ہوا ہے کہ موبائل مطالعے میں رخنہ انداز ہو گیا ہے۔ سوشل میڈیا ہم دیکھ رہے ہیں کہ رفتہ رفتہ پرنٹ میڈیا پر حاوی ہوتا جا رہا ہے۔

(مکمل انٹرویو اندرونی صفحات)

راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا 20 واں سال

Monthly Arxang Lahore

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

ماہنامہ

ارژنگ

لاہور

جلد نمبر 20 | جولائی 2019 | شمارہ نمبر 6

مدیر اعلیٰ ◉ عامر بن علی

مدیر ◉ حسن عباسی

{مجلس ادارت}

ڈاکٹر صغرا صدف ◉ ابرار ندیم ◉ لبنیٰ صفدر

{مجلس مشاورت}

ڈاکٹر جعفر حسن مبارک ◉ ظفر خان (آسٹریلیا) ◉ ارشد نذیر ساحل (سپین)

کمپوزنگ ● زرناب کمپوزنگ : 0321-4730769 نوٹس رائٹر ● نعمان حسن :0333-4918383

آرٹ اینڈ گرافکس ● محمد احسن گل : 0300-4529821

پتہ برائے خط و کتابت

ماہنامہ ارژنگ

F-3 فیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

حسن عباسی : 0300-4489310 آزاد کاڑوی : 0301-4492133

nastalique786@gmail.com

سالانہ ممبرشپ

ماہنامہ "ارژنگ" کے سالانہ خریدار بننے کے لیے مندرجہ ذیل نام اور شناختی پر مبلغ -/1000 روپے بذریعہ منی آرڈر، موبی کیش، یو پیسہ، ایزی پیسہ یا ایل او سی سے رقم بھیجیں اور سالانہ خریدار بن جائیں۔ بکپل کاپی ارسال کر دی جائے گی۔

حسن محمود 0300-4489310 شناختی کارڈ نمبر 31204-7298386-9

فہرست

حمد و نعت / ' 2

طنز و مزاح

○ موٹے لوگ / عطاء الحق قاسمی ' 3

مضامین:

○ چنوا اچیبے: وطن اور جلاوطنی / ڈاکٹر ناصر عباس نیّر ' 4

○ ایٹمی حملے کے بعد کا منظر / ڈاکٹر کوثر محمود ' 15

○ آہ افتخار مجاز! بولتا لاہور خاموش ہو گیا / ناصر بشیر ' 19

○ ناصر کاظمی اور پہلی بارش / لبنیٰ صفدر ' 21

○ "تحفہ" جہاں گردی / راجہ نیّر ' 24

○ نازبٹ کی وارفتگی "گنبد ذات کی بازگشت" ہے ' 26

○ معاصر اُردو غزل کا نمایندہ شاعر.....ارشاد نیازی ' 30

شعری گوشے:

○ آصف ثاقب، نسیم عباسی، پرویز ساحر ' 32 تا 34

ذکرِ فنکار:

○ فریدہ خانم: ملکۂ غزل / ڈاکٹر امجد پرویز ' 35

○ ٹی ہاؤس / اِرم ہاشمی ' 41

○ للی سوارن ' 43

افسانے

○ کملی / سرفراز بیگ ' 44

○ امن کا لبادہ / احمد عدنان طارق ' 44

شاعری 53

مختصر ادبی خبریں ' 55

تبصرہ کتب ' 56

○ انٹرویو: سعید آسی ' 58

○ انٹرویو: اعتبار ساجد ' 62

خطوط ' 64

Far East Marketing Co.

Samaria Mansion 605 Koenji-Minami 1-6-5
Suginami-Ku, Tokyo, 166-0003 Japan
E-mail: femc1@hotmail.com

حمد و نعت

حمد

نہ پاس دنیا نہ دیں ہے صاحب
نصیب اچھا نہیں ہے صاحب
سبب خرابی کا صرف میں ہوں
جہان تو بہتریں ہے صاحب
جو میرے اندر لگا دیا ہے
کمال کا دوربیں ہے صاحب
کہاں سے آتے ہیں اتنے پتھر
لہو لہو ہر جبیں ہے صاحب
ہماری خاطر ہیں آپ کافی
یہ بات کیا دلنشیں ہے صاحب
جو اُلجھنیں ہیں وہ پُرکشش ہیں
ہر ایک جھنجھٹ حسیں ہے صاحب
ملازموں کو خبر نہیں ہے
ہمارے کتنا قریں ہے صاحب
دلوں کی چوری رُکی نہیں ہے
اگرچہ اُن میں مکیں ہے صاحب

حسن عباسی/لاہور

وسعت میں دو جہاں کے جو پھیلی ہے روشنی
صدقے میں مصطفیٰؐ کے وہ اُتری ہے روشنی
اُس اُس جگہ سے ہوگئیں تاریکیاں بھی دُور
جس جس جگہ پر آپؐ کی پہنچی ہے روشنی
معراج کے سفر میں فرشتوں نے یوں کہا
دیکھو تو اِس بشر میں انوکھی ہے روشنی
سورج کی ہو کہ چاند کی، جگنو کہ دیپ کی
نورِ نبیؐ کے سامنے تو میلی ہے روشنی
اُس پیکرِ علوم سے یارو لگا کے ہاتھ
ہر شے نے اپنے ظرف میں لے لی ہے روشنی
دُنیا کی ہر چمکتی ہوئی شے سے دوستو
نورِ نبیؐ کے نور کی اُجلی ہے روشنی
میں نور کیوں نہ آپؐ کو مانوں کے آپؐ کی
نورِ خدا کے نور سے نکلی ہے روشنی
ممکن نہیں رہا ہے اُجالوں کو دیکھنا
اِک روشنی سے مل کے یوں نکھری ہے روشنی
ذہنِ شر کو جن نے جِلا بخش دی ندیمؔ
میرے نبیؐ کے نور کی ایسی ہے روشنی

ریاض ندیم نیازی/سعی

بگڑی ہوئی بن جائے گی ہر بات، کہو نعت
آئی ہے نہ آئے گی کبھی مات، کہو نعت
سرکارِ دو عالمؐ کی غلامی کی بدولت
آ جائے گی پھر خواب میں وہ ذات، کہو نعت
آدابِ عقیدت کا تقاضا بھی یہی ہے
خاموش ہوں لب اشکوں سے برسات، کہو نعت
ان کی ہی عطا سے ہے لگن سوئے مدینہ
ہو صلِ علیٰ لب پہ ہی سوغات، کہو نعت
فریاد مدینے کی طرف کر کے تو دیکھو
مٹ جائیں گے تیرے سبھی صدمات، کہو نعت
لازم ہے زباں تر ہو صدا صلِ علیٰ سے
ہو جائیں گی رد آن میں آفات، کہو نعت
ہو جائے اگر آلِ محمد سے مودت
پھر ہوگی سدا نظر عنایات، کہو نعت
کیا رکھا ہے اس دنیا کے نغمات و غزت میں
ساجد تو انہیں چھوڑ کے دن رات، کہو نعت

محمد امین ساجد سعیدی/حاصل پور

قلم لکھ رہا ہے محمد کی مدحت
مجھے راس آیا ہے دنیا میں جینا
وضو چشمِ تر نے کیا آنسوؤں سے
مجھے نعت گوئی کا آیا قرینہ
بلائیں گے عاصی کو سرکار عالم
کریں گے عطا رحمتوں کا خزینہ
قدم رکھ دیا میرے آقا نے جس جا
وہی عاصیوں کو ہے جنت کا زینہ
میں قدموں میں مولا کے بیٹھوں گا ہر دم
ہے پیش نظر اب مدینہ، مدینہ
محمدؐ کا اسم گرامی ازل سے
چمکتا ہے دل میں مثالِ نگینہ
مری آرزو کو بھی مقبول کر لیں
مدینہ میں بن جائے میرا دفینہ

خالق آرزو

موٹے لوگ

عطاء الحق قاسمی/لاہور

مجھے موٹے لوگوں سے بہت دلچسپی ہے اس کی کئی وجوہات ہیں مثلاً انہیں اپنے موٹاپے کا بہت احساس ہوتا ہے اگر کسی کو نہ ہو تو لوگ دلا دیتے ہیں مجھے ابھی تک کوئی ایسا موٹا شخص نہیں ملا جو اپنے موٹاپے پر حیرت کا اظہار نہ کرتا ہو اور یہ نہ کہتا ہو کہ وہ تو کچھ بھی نہیں کھاتا۔ اللہ جانے موٹا کیوں ہوتا جا رہا ہے ایک دن ایک دوست اسی طرح اپنی حیرانی کا اظہار کر رہے تھے وہ مجھے بتا رہے تھے کہ صبح انہوں نے ایک سوکھا توس چائے کے ایک کپ کے ساتھ لیا، دوپہر کو آدھی چپاتی سالن کے ساتھ کھائی رات کو سوپ پیا اور چند لقمے ابلے ہوئے چاولوں کے لیے، اب اس سے زیادہ اور کیا کیا جا سکتا ہے میں نے کہا اور وہ جو ملاں حلوائی کی دکان سے آپ نے میرے ساتھ رس ملائی کھائی تھی؟ کہنے لگے ہاں یہ تھوڑی بہت بد پرہیزی تو ہی جاتی ہے میں نے انہیں یاد دلایا کہ دوپہر کو خان بابا کا قورمہ بھی کھایا تھا، بولے اب الزام نہ لگاؤ وہ تو میں نے آپ کا ساتھ دینے کے لیے چند لقمے کھائے تھے میں نے کہا ''اور وہ جو جناب نے رات کو حافظ جوس کارنر سے کیلے کا ملک شیک پیا تھا؟ کہنے لگے اب فاقوں تو نہیں مرجانا آخر زندہ بھی تو رہنا ہے میں نے کہا تو پھر انشاء اللہ آپ اس موٹاپے کے ساتھ ہی زندہ رہیں گے!

بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنے موٹاپے کی وجہ اپنی ''خوراک دشمنی'' تسلیم کرنے کی بجائے اس کی کچھ اور وجوہات بتاتے ہیں مثلاً کہیں گے یہ موٹاپا بادی کی وجہ سے ہے ایک دوست جن کا پیٹ شرقاً غرباً پھیلا ہوا ہے اور جسے پیٹ کی بجائے صرف پاپی پیٹ ہی کا نام دیا جا سکتا ہے اس موٹاپے کی ذمہ داری گیس پر ڈالتے ہیں اور گزشتہ برس ہا برس سے اس گیس کا علاج کرنے کے لیے حکیموں کی میٹھی اور لذیذ معجونیں صبح و شام مزے لے لے کر کھاتے ہیں، میں انہیں کہتا ہوں کہ اگر آپ گیس میں اتنے ہی خود کفیل ہیں تو سوئی گیس والوں کو ہر ماہ بلوں کی صورت میں اتنی رقم کیوں دیتے ہیں گھر کے چولہے، گیزر اور ہیٹر وغیرہ اپنی ذاتی گیس پر کرا لیں۔ جواباً وہ دانت نکالنے لگتے ہیں اور یا پھر مجھے بے درد اور سفاک ہونے کا طعنہ دیتے ہیں!

ویسے موٹے لوگ اپنے موٹاپے کو کم کرنے کے لیے محنت بہت کرتے ہیں آپ صبح کسی بھی پارک میں چلے جائیں وہاں موٹے لوگوں کا ''جمعہ بازار'' لگا ہوگا یہاں ہر قسم اور ہر نسل کا موٹا دستیاب ہوتا ہے جب وہ موٹے سیر کے دوران لڑھکتے لڑھکتے ایک دوسرے کے سامنے آتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے جاپان کے دو روایتی پہلوان ایک دوسرے پر جھپٹنے کی تیاری کر رہے ہوں ان کی اکثریت گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے سیر کے بعد سری پائے، حلوہ پوری یا بونگ کا ناشتہ کرتی ہے اور حیران ہوتی ہے کہ اتنی مشقت کے باوجود موٹاپا کم کیوں نہیں ہوا۔ ان میں سے بہت سے لوگ وقفے وقفے کے بعد سمارٹ ہونے کے ٹوٹکے استعمال کرتے رہتے ہیں مثلاً کھانے کے دوران اور کھانے کے بعد پانی نہ پئیں تو چاہے جو کچھ مرضی کھائیں پئیں آپ موٹے نہیں ہوں گے مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ ہوتا وہی ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔

ان امور کے علاوہ ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ میرے ان دوستوں کو ٹرانسپورٹیشن کے سلسلے میں بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے مثلاً تانگے میں سوار ہوتے وقت انہیں کوچوان کا یہ جملہ سہنا پڑتا ہے ''گھوڑے سے آنکھ بچا کر جلدی سے سوار ہو جائیں'' ویگنوں کے ڈرائیور انہیں اسٹاپ پر کھڑا دیکھ کر یا تو گاڑی بھگا دیتے ہیں اور اگر روکیں بھی تو کنڈکٹر موٹے آدمی کا راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا ہے اور کہتا ہے ''صرف ایک سواری کی گنجائش ہے آپ پچھلی ویگن میں آئیں'' پی آئی اے والے مجبور ہیں وہ کسی کو ٹکٹ دینے سے انکار نہیں کر سکتے، البتہ پی آئی اے کا عملہ باقی مسافروں کو ان کی نشستوں پر بٹھاتا ہے جبکہ انہیں نشست میں ٹھونسنا پڑتا ہے اور پھر اس میں سے نکالنے کے لیے بھی عملے کو کمانڈو ایکشن کی ضرورت پڑتی ہے میرے ایک موٹے دوست نے شہر کے اندر اس قسم کے مسائل سے بچنے کے لیے موٹر سائیکل رکھی ہوئی ہے ایک دن ایک صاحب نے ان سے کہا ''آپ کے لیے بہتر ہے کہ آپ کار خریدیں'' جس پر دوست نے جواب دیا ''آپ دعا کریں'' اس پر وہ صاحب بولے ''میں نے کیا دعا کرنی ہے، دعا تو موٹر سائیکل ہی کرے گا''

آخر میں اپنے موٹے دوستوں کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میرا اپنا شمار بھی موٹے لوگوں میں ہوتا ہے اور آپ کو پتہ ہے موٹے لوگ عموی طور پر بہت زندہ دل ہوتے ہیں وہ خود پر کسنے والے جملوں کا نہ صرف برا نہیں مانتے بلکہ دوسروں کے ساتھ خود بھی اس کار خیر'' میں شریک ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنے ''پیٹی بند'' بھائیوں سے یہ لبرٹی لی ہے ویسے ان دنوں موٹاپا کم کرنے کے لیے میں بھی ایک ٹوٹکا استعمال کر رہا ہوں شفا کی صورت میں آپ کو بھی مطلع کروں گا۔

چنوا اچیبے : وطن اور جلا وطنی

ڈاکٹر ناصر عباس نیّر/لاہور

چنوا اچیبے (۱۹۳۰۔۲۰۱۳) جدید افریقی ادب کے امام تصور کیے جاتے ہیں۔انھوں نے جس جدید افریقی ادب کی بنیاد رکھنے میں نہایت اہم کردار ادا کیا اور جسے جلد ہی کینن کا درجہ بھی مل گیا، وہ اپنی ہیئت ،تیکنیک اور زبان کے لیے مغربی جدیدیت پر ضرور منحصر ہے، مگر اپنے مندرجات کے سلسلے میں وہ 'اصل' افریقا کو دریافت کرنے سے عبارت ہے۔یہ ایک انوکھی مخلوطیت (Hybridity) ہے جو پیرایہء اظہار کی سطح پر اجنبی، نئے، جدید، غیر ملکی عناصر اور مافیہ کی سطح پر مانوس ،قدیم اور مقامی عناصر سے عبارت ہے۔یہ مخلوطیت ہمیں دنیا کے بیش تر نو آبادیاتی ممالک کے جدید ادب میں دکھائی دیتی ہے۔

چنوا اچیبے کے نزدیک 'اصل' افریقا کو لکھنے کا مطلب، اس کی روح کو استعماری یورپی بیانیوں سے واگزار کرانا ہے۔سولھویں صدی سے بیسویں صدی کی چھٹی دہائی تک برطانیہ وفرانس کی نوآبادی اور دنیا میں بدترین غلامی اور غلاموں کی تجارت کا شکار ہونے والا افریقا، چنوا اچیبے کا موضوع ہے۔گویا محض افریقا نہیں، استعماری تاریخ کی پیچ در پیچ الجھنوں میں مبتلا ،زخم خوردہ افریقا چنوا کا موضوع ہے۔یورپی نو آبادیات نے افریقا کی سرزمین ہی نہیں ہتھیائی، اس کی ثقافتی روح پر بھی اجارہ حاصل کیا۔انگریزی مصنفین نے افریقا کو تاریخ وفکشن کا موضوع بنایا؛ ہر جگہ افریقا کا ایک سٹیریوٹائپ تصور پیش کیا۔اس تصور کو افریقی سرزمین کے تجربے، اس کی حقیقی تاریخ و ثقافت کے بطن سے اخذ کرنے کے بجائے، افریقا سے 'باہر' نو آبادیاتی تخیل میں وضع کیا گیا اور پھر کمال مہارت سے اسے افریقا پر مسلط کیا گیا۔سفید فاموں نے افریقا کو نیا آئین، تعلیم، انصاف کے ادارے ہی نہیں دیے، انھیں نئی شناخت بھی دی؛ مثلاً نائیجیریا کا نام دیا؛ مختلف قبائل کا مجموعہ کہا اور انھیں ان انسانی اور ثقافتی خصوصیات سے محروم ٹھہرایا جن کا حامل سفید یورپی انسان متصور کیا گیا۔اچیبے کی نظر میں افریقا کا یورپی سٹیریوٹائپ اور اساطیری تصور ہی اس کی روح پر یورپ کا اجارہ ہے۔افریقی روح پر یورپی اجارے سے آزادی ہی چنوا اچیبے کی تحریروں کا بنیادی منشا ہے۔ انھوں نے ۱۹۵۸ میں اپنے پہلے ناول *Fall Apart Things* (جس کا اردو ترجمہ اکرام اللہ نے بکھرتی دنیا کے نام سے کیا ہے) میں افریقی روح کی واگزاری کے جس سلسلے کا آغاز کیا، وطن اور جلا وطنی (لیکچروں کا مجموعہ) اسی کی ایک کڑی ہے۔ہم کہہ سکتے ہیں کہ چنوا اچیبے کے لیے لکھنے (خواہ فکشن ہو یا نان فکشن) کا جو بھی مفہوم و منشا ہے، وہ افریقی قبل نوآبادیاتی، نوآبادیاتی اور بعد نو آبادیاتی تاریخ کے تناظر میں ہے۔

چنوا اچیبے کی غیر افسانوی تحریروں کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ انھیں سوانحی انداز میں لکھا گیا ہے۔چنوا اچیبے کو احساس ہوتا ہے کہ علمی مخاطبے کے لیے نجی تفصیلات اور سوانحی اسلوب موزوں نہیں۔وہ اپنے اس احساس کا تجزیہ نہیں کرتے، مگر بالواسطہ طور پر یہ باور کراتے ہیں کہ اس احساس کے پیدا ہونے کا سبب مغربی علمی ذوق اور معیار ہے جس میں شخص و ذات کی نفی اصول کا درجہ رکھتی ہے۔چنوا اچیبے نہایت آہستگی مگر قوی انداز میں ان مغربی معیارات سے مبارزت طلب ہوتے ہیں جنھیں یورپ کے ام البلاد میں تشکیل دیا گیا اور جن کا گہرا تصوریاتی تعلق نو آبادیاتی نظام سے ہے۔چناں چہ انھیں سوانحی اسلوب سے دست کش ہونا نہ صرف غیر مناسب لگتا ہے بلکہ اپنے مئوقف کو واضح کرنے کے لیے اسے اختیار کیے رکھنا لازم بھی محسوس ہوتا ہے۔وہ جس 'اصل' کو لکھنا اور باور کرانا چاہتے ہیں، اس کے لیے شخصی اسلوب اور نجی حوالے ہی موزوں ہیں۔اصل یہ ہے کہ وہ اس طور افریقا کی حقیقی روایت کی مستند بازیافت کرتے ہیں جسے مسخ کیا گیا، انسانی یادداشت سے حذف کیا گیا یا حاشیے پر دھکیل دیا گیا۔

وہ نسلاً اگبو ہیں۔ان کے والدین نے ہر چند عیسائیت قبول کر لی تھی اور ان کے والد انگریزی کلیسا کے مبلغ بھی بن گئے تھے، مگر چنوا اچیبے نے اس نئی شناخت کو منفعل انداز میں قبول نہیں کیا اور ایک راسخ العقیدہ عیسائی کے طور پر جینے کا راستہ منتخب نہیں کیا؛ ان کی تحریروں سے کہیں ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ اخذِ معانی کے لیے عیسائی روایات سے رجوع کرتے ہوں؛ ان کی تحریروں کی پشت پر جس تصورِ کائنات کی تنویر موجود ہے، وہ اگبو روایات ہیں اور جن کا بڑا حصہ مذہبی و اساطیری ہے۔اسی طرح انھوں نے جدید انگریزی تعلیم بھی حاصل کی؛ انگریزی ادبیات کا مطالعہ کیا اور انگریزی ہی میں فکشن لکھا؛ یہی نہیں فکشن کی جدید یورپی ہیئت یعنی ناول کو بھی اختیار کیا اور اپنی غیر افسانوی تحریروں کے لیے مضمون کی یورپی صنف اختیار کی، یہاں تک کہ ان کے لیکچر بھی مغربی ہیئت و اسلوب کے حامل ہیں۔یعنی بہ ظاہر کہیں محسوس نہیں

ہوتا کہ انھوں نے یورپی سامراج کی چیرہ دستیوں کو جھیلا ہو جن کے شکار ان کے ہم وطن رہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ مذہبی، تعلیمی اور ادبی اعتبار سے 'یورپی' ہونے کے باوجود انھوں نے اگبو لوگوں کے لیے اس قدر ولولہ خیزی کیوں کر اختیار کی؟ یہ سوال اس وقت زیادہ اہم ہو جاتا ہے جب ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ اپنے والد کے ساتھ ۱۹۳۵ میں، پانچ سال کی عمر میں آبائی قصبے اوگڈی میں لوٹے تو انھیں معلوم ہوا کہ ان کے آبائی گھر میں ان کے چچا نے (جو اپنے اگبو مذہب پر قائم تھے) اکنیا گا اور دوسرے گھریلو دیوتاؤں کا 'غیر عیسائی عبادت خانہ' بنا رکھا تھا، جس کے خلاف اچیبے کے والد نے سخت ردِّعمل کا اظہار کیا تھا۔ یہ ردِّعمل خود اچیبے کے لیے ایک واضح پیغام بھی تھا۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ چنوا اچیبے نے والد و چچا کی کش مکش اور ان کے گھر کی بیٹھک (جسے مقامی زبان میں پیازا کہتے ہیں) میں کفر و راستی کے مباحثوں ہی میں اپنے لیے ایک راستہ منتخب کیا۔ انھوں نے اپنے والد کی بجائے اپنے چچا کا راستہ چنا؛ اپنے والد کی طرح گرجا میں خدمات انجام دینے اور عیسائیت کی تبلیغ کی بجائے 'غیر عیسائی اور کافرانہ اگبو ثقافت' کی بازیافت کو اپنی باطنی زندگی کا مقصد و منشا بنایا۔ وہ ایک یورپی اور عیسائی کی بجائے اگبو بنے۔ ان کا اگبو ہونا، نسلی مفہوم نہیں رکھتا۔ انھوں نے اپنی اس اگبو شناخت کو اخذ کیا، اس کا احیا کیا، اس تک رسائی کی سعی کی جس پر نئے مذہب اور نئے تصورات کا سایہ مسلط تھا۔ ان خطبات میں چنوا اچیبے نے یہ واضح تو نہیں کیا کہ والد کی بجائے چچا کے راستے پر چلنے کے فیصلے کا محرک کیا تھا، تاہم اس کا جواب انھی خطبات میں بین السطور موجود ہے۔ اگر اچیبے اپنے والد کے ساتھ آبائی گھر واپس نہ آتے اور اگبو لوگوں میں رہنا سہنا شروع نہ کرتے تو شاید وہ اپنے والد ہی کی روش اختیار کرتے، مگر گھر واپسی جلد ہی ایک پانچ سالہ بچے کے لیے استعارہ بن گئی۔ اوگڈی اور اس کی زندہ ثقافت، ننھے چنوا اچیبے کے لیے اپنے نو عیسائی باپ سے کہیں 'بڑی، متنوع، دل فریب' تھی اور اس کے اجتماعی لاشعور کے گہرے پانیوں میں ہلچل پیدا کرنے کی صلاحیت سے مالا مال تھی!

اپنی اگبو شناخت کے اوّلین مرحلے میں وہ اگبو لوگوں کو ان تحقیری شناختوں سے آزاد کرانے کی سعی کرتے ہیں جو یورپیوں نے ان پر مسلط کیں۔ ان میں ایک شناخت قبیلہ کی ہے۔ اچیبے کہتے ہیں کہ قبیلہ ایک ہتک آمیز تصور ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگبو نہ تو عہد عتیق کے لوگ ہیں نہ ایک بولی بولتے ہیں؛ ان کے پاس ایک اپنی زبان موجود ہے جس کی کئی بولیاں ہیں اور نہ ان کا کوئی ایک سردار ہے۔ عہد عتیق، بولی اور سردار، یہ تین چیزیں ایسی ہیں جو یورپی تعریف کے مطابق کسی گروہ کو ایک قبیلہ ثابت کرتی اور پھر اسے تہذیبی ترقی کے اعتبار سے پس ماندہ ٹھہراتی ہیں۔ اچیبے، واضح کرتے ہیں کہ اگبو لوگوں میں قبیلے کی بجائے قوم کی خصوصیات ہیں۔

یورپی استعمار نے ایشیا، افریقا و لاطینی امریکا کو کئی زنجیریں پہنائیں۔ ان میں ایک بڑی زنجیر اجتماعی شناخت کا تصور تھا؛ کہیں یہ قبیلہ اور کہیں قوم تھا۔ قبیلہ اس لیے ہتک آمیز تصور تھا کہ اسے قوم کے اس تصور کے مقابلے میں وضع کیا گیا تھا جسے یورپ نے خود اپنے لیے اختیار کیا تھا۔ برطانیہ، فرانس، جرمنی، ہسپانوی، پرتگالی، ڈچ ایک قوم تھے؛ ایک زبان بولتے تھے، ایک خطے میں رہتے تھے، ایک نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ قوم کا تصور جس قدر پرشکوہ تھا اور قبیلے کا تصور اسی قدر اہانت آمیز تھا۔ ارنسٹ رینان کا ۱۱ مارچ ۱۸۸۲ کو سوبورن میں دیا گیا مشہور لیکچر ایک طرح سے قوم کے یورپی تصور کا پروٹوٹائپ ہے۔ اس میں ایک اہم نکتہ یہ تھا کہ ''قوم ایک روح اور ایک روحانی اصول ہے... فرد کی طرح قوم ماضی کی طویل جدوجہد، ایثار اور اخلاص کا عروج ہے۔'' ماضی کی طویل جدوجہد میں نسل، زبان، عظیم سورماؤں کی قربانیاں سب شامل ہیں۔ یہ جدوجہد قوم کے تصور کو ایک تقدس اور عظمت دیتی ہے اور افراد کو پھر اس تصور پر قربان ہونے کی الوہی ترغیب دیتی ہے۔ ایشیا و افریقا نو آبادیاتی عہد سے پہلے نسل، زبان، مذہب، جغرافیے کی اساس پر تشکیل پانے والے اس تصور قوم سے نابلد تھے۔ یورپی تصورِ قوم خود ان کے لیے تقدس آمیز وحدت آفریں قوت تھا، مگر نو آبادیاتی یوں میں یہ تصور ان کے استعماری تصوریات ہی کا ایک حصہ تھا۔ بالعموم اس تصور کے ذریعے اوّلاً نسلی، لسانی، مذہبی و جغرافیائی وحدتیں ابھاری گئیں اور پھر ان میں تقسیم و فساد کا بیج بویا گیا؛ ثانیاً اس کے ذریعے اپنے لیے وفاداری کے جذبات ابھارنے کا کام لیا گیا۔ (آخر الذکر کی اہم مثال اردو میں انجمن پنجاب کے مناظموں میں سامنے آنے والی 'قومی شاعری' ہے)۔ تاہم بعد میں یہی تصورِ قوم استعمار سے آزادی کا بھی موجب بنا۔ اسی سے ملتی جلتی صورت ہمیں انگریزی کی تعلیم میں بھی نظر آتی ہے۔ انگریزی زبان و ادب کی تعلیم کا آغاز نو آبادیاتی عہد میں پہلی مرتبہ ہندوستان میں شروع ہوا اور بڑی حد تک اسے 'لبرل آئیڈیالوجی' کی حامل بنا کر پیش کیا گیا، نیز ایک ایسا مخلوط/دوغلا طبقہ پیدا کرنے کی سعی کی گئی جو سفید اور کالوں کے درمیان ترجمان کا

کردار ادا کر سکے۔ یہ طبقہ بلاشبہ وجود میں آیا اور اس کے نمایندے آج بھی موجود ہیں، مگر یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ یہ مقامی انگریزی تعلیم یافتہ لوگ ہی تھے جنھوں نے استعماریت پر تنقید اور اس کے خلاف جدوجہد کا آغاز کیا۔ لہٰذا مابعد نوآبادیاتی تھیوری ہمیں ایک بار پھر یہ بات باور کرنے کی پرزور ترغیب دیتی ہے کہ کوئی بھی روایت فطری نہیں ہوتی؛ یہ کسی کو از خود محض کسی گروہ سے نسلی، لسانی، یہاں تک کہ مذہبی تعلق کی بنا پر اسے حاصل نہیں ہو جاتی؛ اسے ایک خاص مؤقف اختیار کر کے اخذ کیا جاتا ہے۔ یہی دیکھیے: اچیبے کے والد انگریزی تعلیم سے محروم تھے، مگر یورپ و عیسائیت کے کٹر حامی تھے، اچیبے نے اگبو زبان میں کچھ نہیں لکھا، مگر اس زبان اور اس میں موجود اساطیر و روایت کے سب سے اہم علم بردار ہیں۔ ہمارے یہاں سرسید اور حالی انگریزی سے نابلد تھے مگر اس کے شدید حمایتی تھے اور انھی کے زمانے میں انگریزی تعلیم یافتہ بنگالیوں نے انگریزی اقتدار پر سوال اٹھانا شروع کر دیا تھا جن پر سرسید نے شدید تنقید کی۔ چناں چہ قوم کا تصور ہو، یا انگریزی، ان کے سلسلے میں ایک خاص مؤقف ہی انھیں نوآبادیاتی قوت کا حلیف یا حریف بناتا ہے۔

اگبو لوگوں کو قوم کے یورپی تصور کے قریب تر قرار دینے کے بعد چنوا اچیبے اپنے لوگوں کے انفرادیت پسند اور اسی بنا پر جمہوریت پسند ہونے کا تصور پیش کرتے ہیں۔ ظاہر ہیں، یہ دونوں تصورات بھی یورپی الاصل ہیں۔ تاہم اچیبے ان تصوارت کی اصل کے بکھیڑے میں الجھنے کی بجائے یہ ثابت کرنے کی سعی کرتے ہیں کہ اگبو لوگ خود اپنے سیاق میں 'جدید' ہیں۔ اچیبے، اگبو لوگوں یا افریقی قوم کے انفرادیت پسند ہونے کی گواہی ان کی اساطیر، قصباتی زندگی اور عملی زندگی کی جدوجہد سے لاتے ہیں۔ اگبو لوگ آٹھ سو قصبات میں بکھرے ہوئے تھے۔ ہر قصبہ ایک اپنی انفرادیت بھی رکھتا تھا اور دوسرے قصبات سے کئی باتوں میں مشترک بھی تھا۔ لکھتے ہیں: ''اوگڈی کا قصبہ، جہاں میرے والد ۱۹۳۵ میں لوٹے، ان سیکڑوں قصبوں میں سے ایک تھا جو درحقیقت صغیری ریاستیں تھے۔ یہ سب اپنی انفرادی شناخت سے سرشار تھے اور ساتھ ہی خود کو اگبو لوگوں کے عمومی نام سے مشخص کرتے تھے۔'' اپنے نقطۂ نظر کے حق میں وہ اگبو اساطیر سے دلیل لاتے ہیں۔ اگبو لوگوں کے عقیدے کے مطابق ان کا سب سے بڑا دیوتا چک ووتھا۔ چک وو نے اوگڈی کے جد امجد ایزی چوامباغا (Ezechuamagha) کو پیدا کیا۔ اسی چک وو نے ذرا فاصلے پر ایک دوسرے قدیمی انسان ایزو ماکا (Ezumaka) کو تخلیق کیا جو اوگڈی کے پڑوسی قصبے نکوبلی کا باپ ہے۔ دونوں قصبوں کے درمیان چک وو نے نکیسی دریا کو پیدا کیا تا کہ دونوں کے بیچ بہے اور دونوں کے درمیان سرحد کا کام بھی دے۔ اسی طرح اگبو لوگوں کا عقیدہ ہے کہ ہر شخص کا ایک نجی دیوتا ہے جسے چی کا نام دیا گیا ہے۔ (یہ اساطیری مذہبی تصورات ناول بکھرتی دنیا میں بھی پیش ہوئے ہیں)۔ اس طور چنوا اچیبے کے مطابق اگبو تصور کائنات میں ہر اگبو شخص اور ہر اگبو قبیلہ انفرادیت بھی رکھتا ہے اور دوسرے اگبو لوگوں اور اگبو قصبات سے منسلک بھی ہے۔ یہ ایک متناقض تصور ہے: اگبویت میں شریک رہتے ہوئے، اپنی انفرادیت کا تحفظ کیوں کر ممکن ہے؟ اس تناقض کا جواب وہ ایک اگبو کہانی کے ذریعے دیتے ہیں۔

ایک صبح تمام جانور قصبے کے ڈھنڈورچی کے بلاوے پر جلسے میں شریک ہونے جا رہے تھے جو ایک عوامی جگہ پر منعقد ہونا تھا۔ تمام جانوروں کو حیرت تھی کہ مرغ ان کے ساتھ نہیں تھا۔ جب اس کے پڑوسیوں اور دوستوں نے سبب پوچھا تو مرغ نے ایک ضروری ذاتی کام کا بہانہ بنایا۔ تاہم مرغ نے انھیں کہا کہ وہ جلسے کے شرکا کو اس کی نیک خواہشات پہنچائیں اور یہ پیغام دیں کہ وہ ان کے ہر فیصلے کی بسر و چشم پابندی کرے گا۔ اس اچانک جلسے کے انعقاد کا سبب ایک ناگہانی پریشانی تھی جو انسانوں کی طرف سے انھیں لاحق ہوئی تھی۔ انسانوں نے جب سے اپنے دیوتاؤں کو خون کی قربانی پیش کرنا سیکھا تھا، وہ جانوروں کا خون بہانے لگے تھے۔ جانوروں کی اس مجلس میں خاصے غور و فکر اور بحث مباحثے کے بعد یہ قرارداد منظور کی گئی کہ قربانی کے ابتدائی جانور کے طور پر مرغ کو پیش کیا جائے۔ یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

بر سبیل تذکرہ، ہمیں یہاں دسویں صدی عیسوی کے اخوان الصفا کا بائیس نمبر رسالہ یاد آتا ہے، جس میں جانور جنوں کے بادشاہ بیورا سے انسانوں کے ظلم و تعدی کا استغاثہ پیش کرتے ہیں۔ اگبو کہانی کا مرکزی خیال انسانوں کے خلاف استغاثہ نہیں، انسانوں کی طرف سے لاحق مصیبت پر غور و فکر ہے۔ بہ ہر کیف مندرجہ بالا کہانی میں اچیبے کو انفرادیت و اجتماعیت کی بہ یک وقت موجودگی کے تناقض کا جواب نظر آتا ہے۔ عوامی مجلس، ایک ایسی جگہ ہے جہاں ہر ایک جا سکتا اور اپنا اظہار کر سکتا ہے۔ تاہم یہ مجلس ہر ایک کی انفرادیت کے تحفظ کی ضمانت اس وقت دیتی ہے جب وہ وہاں موجود ہو اور اپنا مدعا خود اپنے منھ سے بیان

کرے۔مرغ کے خلاف اس لیے فیصلہ ہوا کہ وہ اپنا مدعا بیان کرنے کے لیے موجود نہیں تھا، حالاں کہ اسے بھی دعوت دی گئی تھی۔اسی کہانی سے اچیبے یہ نتیجہ بھی اخذ کرتا ہے کہ اگبو لوگ سنجیدہ جمہوریت پسند ہیں۔چنوا اچیبے کے لیے یہ محض ایک کہانی نہیں، بلکہ اس کے ذریعے ان کی قوم کی ثقافتی روح میں اترے ہوئے ایک بنیادی اصول کا اظہار ہوا ہے۔یہ اصول کہ ایک شخص کو اگر اپنی بقا اور انفرادیت عزیز ہے تو اسے اپنی زبان سے اپنا منشا ظاہر کرنا ہوگا۔یہ صرف ایک قدیمی اسطورہ کی نئی تعبیر نہیں، نوآبادیاتی جبر سے نجات کا ایک نسخہ کیمیا بھی ہے۔خود اچیبے نے اسی لیے اپنی قوم کی کہانی خود لکھی ہے۔اس کہانی کے بعض اور پہلو بھی توجہ طلب ہیں۔ایک یہ کہ اجتماعیت ہی انفرادیت کا تحفظ کرتی ہے؛ یعنی انفرادیت، محض ایک شخص کا اعلانِ ذات نہیں، اس اعلانِ ذات کی عام سماجی توثیق کا نام انفرادیت ہے۔دوسرا یہ کہ ایک اجتماعی مصیبت سے آزادی کے عام مباحثے میں، اس گروہ کے ایک شخص کی عدم موجودگی اس کی دائمی سزا کا باعث ہوسکتی ہے۔کسی اور سیاق میں خاموشی عبادت ہوگی، اجتماعی مسائل میں خاموشی نا قابلِ معافی جرم ٹھہرتی ہے۔

چنوا اچیبے اپنے خطبات میں گہرے تجزیے اور فلسفیانہ انداز سے بالعموم گریز کرتے ہیں، تاہم کچھ باتوں کے سلسلے میں انھوں نے فلسفیانہ سوالات اٹھائے ہیں۔مثلاً انفرادیت کے سلسلے میں۔اچیبے کے لیے اگبو لوگوں کی انفرادیت کا مسئلہ پہلی سطح پر نوآبادیاتی پس منظر رکھتا ہے، مگر گہری سطح پر یہ اگبویت اور انسانی پہچان کا ایک فلسفیانہ سوال ہے۔استعمار نے اگبو لوگوں پر 'نئی شناخت' مسلط کی، جس نے انھیں حقیقی شناخت سے محروم (Dispossess) کیا۔اچیبے اپنی قوم کی اصلی شناخت بحال کرنا چاہتے ہیں؛ نظری طور پر اصلی شناخت منفرد بھی ہوگی۔یہ منفرد شناخت ان کے ماضی کی کہانیوں، اساطیر اور تاریخ میں مضمر ہے اور ان کی عملی زندگی میں ممکنہ حد تک رواں دواں ہے۔اسی مقام پر اگبو انفرادیت کے تصور میں ایک فلسفیانہ جہت پیدا ہوتی ہے۔اچیبے کہتے ہیں ''[اگبو] فرد کسی جاری عمومی صنفی (جنرک) تخلیقیت کی پیداوار نہیں، بلکہ ایک خصوصی الوہی سرگرمی جو ایک مرتبہ اور حتمی طور پر ہوتی ہے، کی پیداوار ہے۔ایسے فرد کی قدر و قیمت کا اثبات کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسانی تخیل یکتائی کے راستے پر دور تک جاسکتا ہے۔'' یہاں ایک بار پھر ہمیں اچیبے ایک مشکل کا سامنا کرتے محسوس ہوتے ہیں جو مابعد نوآبادیاتی مطالعات کی عمومی مشکل ہے۔اچیبے کی مخاطب مغربی دنیا ہے جس کے ایک حصے نے ان کی قومی شناخت سے متعلق طرح طرح کے سٹیریوٹائپ تشکیل دیے، اس لیے وہ ان کی زبان اور ان کا محاورہ اختیار کرنے سے باز نہیں رہ سکتے، مگر ساتھ ہی اس خطرے سے بھی مسلسل دوچار رہتے ہیں کہ کہیں اُن کی زبان و محاورے میں قومی شناخت کی بحالی کا مقصد اس طرح غائب نہ ہو جائے جس طرح اوپر کی کہانی میں مرغ غائب ہو گیا تھا۔وہ اس بات سے آگاہ ہیں کہ انفرادیت کا تصور محض مغربی نہیں، جدید مغرب کا سب سے بڑا تفاخر بھی ہے۔ہر تفاخر میں ایک نوع کی نرگسیت راہ پا جاتی ہے۔چناں چہ مغرب جب غیر مغربی دنیا پر نظر ڈالتا ہے تو اپنی اس نرگسیت پسندی کی وجہ سے اسے غیر مغربی دنیا انفرادیت سے خالی ہی نظر نہیں آتی، پس ماندہ، غیر جمہوری اور مطلق العنان بھی دکھائی دیتی ہے۔اگبو لوگوں کی قبائلی شناخت میں یہی تصورات موجود تھے جن کی تصحیح اچیبے ضروری خیال کرتا ہے۔اچیبے کے لیے مسئلہ افریقا سے متعلق یورپی بیانیوں کی تردید و تنسیخ کا بھی ہے اور تصحیح کا بھی۔لہٰذا وہ اگبو انفرادیت کو مغربی انفرادیت سے مختلف قرار دیتے ہیں۔مغربی انفرادیت میں الوہی عنصر نہیں، وہ ایک 'جنرک' قسم کی چیز ہے؛ ایک سماجی تشکیل ہے جب کہ اچیبے اگبو انفرادیت کو اس کی الوہیت ہی میں دریافت کرتے ہیں۔اس کی اہم مثال ہر اگبو شخص کا ایک اپنے چی کا حامل ہونا ہے۔مگر سوال یہ ہے کہ کیا اچیبے 'الوہی انفرادیت' کے تصور کے ذریعے اپنی افریقی شناخت کو مغربی شناخت سے یک سر مختلف ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں؟ اس سوال کا اثبات میں جواب دینا مشکل ہے۔

اچیبے جسے اگبویت یا اپنی قوم کی انفرادیت کے نام سے سامنے لاتے ہیں، وہ دراصل اپنی اساطیری تاریخ کی تعبیر ہے۔یہ تعبیر حیرت انگیز طور پر ژونگ کی فردیت کے تصور کے مماثل ہے۔چی کا تصور بڑی حد تک ذات کے آرکی ٹائپ کے مماثل ہے۔جس طرح ہر شخص کے اجتماعی لاشعور میں ذات کا آرکی ٹائپ موجود ہے، اسی طرح ہر اگبو شخص کے پاس اس کا اپنا نجی دیوتا چی موجود ہے۔اچیبے کا خیال ہے کہ اگبو لوگوں کے یہاں انفرادی آزادی کی لازمی ضرورت کا احساس ہوتا ہے، مگر عملاً کامل آزادی ممکن نہیں ہوتی۔یہی کچھ فردیت کے مفہوم میں مضمر ہے۔بہ قول جیمز البرٹ ہال فردیت ''ایک ایسا عمل ہے جس میں ایک شخص اپنی حقیقی زندگی میں شعوری طور پر اپنی سائیکی کی مخفی انفرادی صلاحیتوں کو سمجھنے اور ترقی دینے کی کوشش کرتا ہے۔چوں کہ آرکی ٹائپل امکانات بے

حد وسیع ہیں،اس لیے کوئی بھی فردیت کا عمل لازماً ناکام ہوتا ہے،اس سب کو حاصل کرنے میں جو داخلی طور پر ممکن ہے۔۔اہم بات یہ نہیں کہ وہ کتنا کامیاب ہوا، بلکہ یہ کہ وہ اپنی گہری صلاحیتوں میں کس قدر سچا ہے،یعنی آیا وہ محض اپنی انا مرکزیت اور نرگسی رجحانات کی پیروی کر رہا ہے یا اجتماعی ثقافتی کردار کے ساتھ خود کو مشخص کر رہا ہے؟'' گویا صاف محسوس ہوتا ہے کہ اچیبے انفرادیت کے اسی تصور کی توثیق کر رہے ہیں جو ایک یورپی ماہر نفسیات نے پیش کیا۔وہ اس کے لیے اپنی اساطیر سے ضرور مدد لیتے ہیں (ژونگ نے بھی اساطیر ہی پر انحصار کیا)،مگر تعبیر کا طریقہ یورپی ہے۔کیا ہم یہ سمجھیں کہ مابعد نو آبادیاتی فکر یورپی معیارات سے مبارزت طلبی کے علی الرغم مقامی تصورات کو آفاقی ریورپی تصورات کے ہم پلہ ثابت کرنے سے گریز اختیار نہیں کر سکتی؟ مابعد نو آبادیاتی مطالعات میں بعض مقامات ایسے آتے ہیں جہاں مغرب محبوب بھی ہوتا ہے اور رقیب بھی؛اس سے لاگ،لگاؤ اور رشک کے متنوع جذبات وابستہ ہوتے ہیں۔

چنوا اچیبے،یورپی استعمار کے مقابلے میں اگبو کی انفرادیت اجاگر کرنے کے لیے ایک اور نیم تاریخی قصے کا سہارا لیتے ہیں۔

میں نے سنا اوگڈی کے پڑوسی قصبات میں سے ایک قصبہ کافی عرصہ پہلے ہجرت کر کے آیا اوگڈی سے درخواست کی کہ اسے وہاں آباد ہونے کی اجازت دی جائے۔ان دنوں کافی زمین تھی،اس لیے انھیں خوش آمدید کہا گیا۔ان لوگوں نے دوسری درخواست کی جو زیادہ حیران کن تھی:انھیں بتایا جائے کی اوگڈی کے خداؤں کی پوجا کیسے کی جاتی ہے؟(ان کے اپنے خداؤں کے ساتھ کیا ہوا؟) اوگڈی کے لوگ پہلے حیران ہوئے۔بالآخر فیصلہ ہوا کہ ایک آدمی جو آپ سے خدا طلب کرتا ہے،اس کی الم ناک کہانی ہوگی جس کی چھان بین مناسب نہیں۔پس انھیں اوگڈی کے دو خدا دے دیے گئے۔اودوا اور اُگ ڈگ دو۔بس ایک شرط کے ساتھ کہ اودو کو اودو کا بیٹا اور اُگ ڈگ دو کو اس کی بیٹی کے طور پر مخاطب کیا جائے تاکہ کوئی الجھن پیدا نہ ہو۔

اچیبے اس کہانی سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے ''کہ اگبو لوگوں نے اپنے مذہبی اعتقادات مسلط کرنے کی کوشش نہیں کی،حالاں کہ اس کی درخواست کی گئی۔'' یہاں اچیبے ایک نئی قسم کی استعماریت کا تصور متعارف کرواتے ہیں:مذہبی استعماریت۔نیز اس بات کو اگبو لوگوں کی انفرادیت اور امتیاز کے طور پر خراج تحسین پیش کرتے ہیں کہ ''اگبو لوگ مذہبی استعماریت کی نفسیات کا کوئی تصور نہیں رکھتے تھے۔'' مذہبی استعماریت کے ذریعے یورپی استعمار کاروں کی طرف طعن آمیز اشارہ ہے۔وطن اور جلا وطنی میں انگریزوں کی مذہبی استعماریت کا زیادہ بیان نہیں،مگر بکھرتی دنیا میں اسے تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔مذکورہ بالا نیم تاریخی قصے کے مقابل بکھرتی دنیا سے یہ اقتباس دیکھیے:

مسٹر براؤن نے کہا:''کوئی دیوتا نہیں...تم لکڑی کے ایک ٹکڑے کو تراشتے ہو....جس طرح وہ پڑا ہے۔'' (اس نے لکڑی کی کڑیوں کی طرف اشارہ کیا جس کے ساتھ آکونا خاندان کا تراشا ہوا'' آئی کنگا'' لٹک رہا تھا)''تم اسے دیوتا کہتے ہو۔لیکن اس کے باوجود یہ لکڑی کا ایک ٹکڑا ہی ہے۔''

آکونا بولا:''ہاں۔بلاشبہ یہ لکڑی کا ایک ٹکڑا ہی ہے،لیکن وہ درخت جس سے یہ نکلا ہے،اسے چک وو نے ہی دیگر دیوتاؤں کی مانند تخلیق کیا تھا،لیکن اس نے انھیں اپنے پیغام بروں کی حیثیت سے بنایا تھا تاکہ ہم ان کی وساطت سے اس تک پہنچ سکیں۔اب اپنی مثال لے لو۔تم اپنے گرجا کے سربراہ اعلیٰ ہو۔''

مندرجہ بالا قصے اور ناول کے اس مختصر اقتباس کے تقابل سے معلوم ہوتا ہے کہ پس ماندہ،غریب افریقی دوسروں کو اپنے خدا دیتے ہوئے یہ احتیاط برتتے تھے کہ کہیں ان کے خداؤں کو کسی المناک صورت سے دوچار لوگوں پر تسلط حاصل نہ ہو جائے۔نیز چاہتے تھے کہ دونوں کے خداؤں کی انفرادیت اور فرق قائم رہے،مگر یورپیوں نے انھی غریب افریقیوں کے دیوتاؤں کو برا بھلا کہا اور ان کے اندر گناہ گار ہونے کا احساس پیدا کیا۔اس سارے عمل میں حد درجہ کی مضحکہ خیزی یہ تھی کہ افریقیوں کے گناہ گار ہونے کا احساس انھی کی دیوتاؤں/خداؤں کے ذریعے پیدا کیا گیا۔یہاں عیسائی مشنریوں کی اپنے عقائد کے سلسلے میں نیک نیتی سے بحث نہیں،بس یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ عیسائی مشنری،اسی استعماری نظام کے افریقا میں نفاذ کی کوششوں کا ساتھ دے رہے تھے،جس نے افریقا کو نئی تعلیم،نیا آئین اور نئی حکومت دی۔تبدیلیِ مذہب کی مساعی،سیاسی و معاشی استعماریت کے ہم رکاب چلی اور اسی وجہ سے تبدیلیِ مذہب بھی ایک قسم کی استعماریت میں بدل گئی۔یہاں بین السطور اچیبے یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ حقیقت میں مہذب کون؟ دوسروں کی انفرادیت کا تحفظ کرنے والے یا اسے ملیا میٹ کرنے والے؟ نیز اچیبے اس طرف توجہ بھی دلاتے ہیں کہ افریقی کیوں کر غلام بنے۔دوسروں کی انفرادیت کے تحفظ کا جذبہ انھیں

ایک قسم کی انفعالیت سے ہم کنار کرتا تھا؛ ہر چند یہ انفعالیت انھیں دوسروں پر تسلط کی خواہش سے آزاد رکھتی تھی، مگر زیر تسلط آنے کا سامان بھی کرتی تھی۔

چنوا اچیبے نے اپنی افریقی شناخت کی بازیافت کے باقاعدہ آغاز کا سلسلہ یونیورسٹی کے ان دنوں (۱۹۵۲) سے جوڑا ہے جب ان کے ایک ہم جماعت نے جوائس کیری کے ناول مسٹر جونسن کے سلسلے میں کہا کہ وہ اس ناول کے صرف اس حصے سے لطف اندوز ہوا جب نائیجیریائی ہیرو مسٹر جونسن اپنے برطانوی آقا مسٹر رڈ بک کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اترا۔ انگریزی کے استاد یہ طنزیہ رائے سن کر سکتے میں آ گئے تھے۔ اس لیے کہ اس ناول کو ٹائم میگزین نے اپنی ۲۰ر اکتوبر ۱۹۵۲ کی اشاعت میں افریقا سے متعلق لکھا گیا بہترین ناول قرار دیا تھا اور پورے یورپ میں اس کی دھوم تھی۔ اچیبے نے اسے یورپ کے ام البلاد کی کینن سازی کے خلاف ایک تاریخی بغاوت کا نام دیا ہے۔ وہ ایک افریقی طالب علم کی کسی ادبی متن سے متعلق ایک تنقیدی رائے نہیں ،ایک واضح ، پرزور انکار تھا، اس بات کے خلاف کہ افریقا سے متعلق ایک آئرشی برطانوی مصنف کے ناول کو غیر افریقی لوگ بہترین کیوں کر قرار دے سکتے ہیں۔ یہ انکار ناول کی ہیئت اور اس کی بیانیاتی عظمت کا نہیں تھا، اس کے موضوع سے متعلق دعوے کا تھا۔ اچیبے اور ان کے ہم وطن اپنے انگریزی نصابات میں شیکسپیئر، ملٹن، ڈیفو، سوئفٹ، ورڈزورتھ، کالرج، کیٹس، ٹینی سن، ہاؤس مین، ایلیٹ، فراسٹ، جوائس، ہیمنگوے اور کونارڈ سے متعارف ہو چکے تھے، مگر جوائس کیری کے مسٹر جونسن اور اس سے متعلق یورپی تنقیدی دعووں نے مزاحمت پر آمادہ کر دیا تھا۔ آخر انگریز و امریکی مصنفین کے شعری و فکشنی متون کی بجائے، ایک آئرشی برطانوی مصنف کے ناول کے خلاف بغاوت و مزاحمت کیوں ہوئی؟ یہ سوال نہ صرف اچیبے کو بلکہ عمومی طور پر مابعد نوآبادیاتی فکر کو سمجھنے میں بھی اہم حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ تمام نوآبادیاتی ممالک میں انگریزی نظام تعلیم کے ساتھ ہی انیسویں و بیسویں صدی کے ممتاز مغربی تخلیق کار متعارف ہوئے۔ ڈرامے میں شیکسپیئر، شاعری میں ملٹن، کالرج، ورڈزورتھ، ایلیٹ وغیرہ، فکشن میں لارنس، جوائس، ہیمنگوے وغیرہ۔ ان سب کو شوق سے پڑھا گیا، ان کی تقلید بھی کی گئی۔ خود اچیبے کہتے ہیں کہ انھوں نے انگریزی فکشن نگاروں ہی سے متاثر ہو کر انگریزی میں لکھنا شروع کیا۔ ان کے خلاف ردعمل (جو کبھی شدید نہیں ہوا) اس وقت ہوا، جب یہ احساس عام ہوا کہ انھیں ادب کے آفاقی کینن کی صورت پیش کیا گیا تھا اور ان کے ادبی معیارات مقامی ادبی معیارات سے نہ صرف متصادم تھے، بلکہ انھیں انتہائی خاموشی کے ساتھ تہ و بالا کرنے کا ایک داخلی میلان رکھتے تھے۔ مگر جوائس کیری کے خلاف فی الفور اور شدید ردعمل اس لیے ہوا کہ وہ افریقا سے متعلق اس سٹیریوٹائپ روایت کا پروردہ تھا جسے اس نے سنڈے سکول، رسائل، سفرناموں، اور برطانوی معاشرت میں انیسویں صدی کے آخر تک رائج خیالات سے سیکھا تھا۔ اچیبے زور دے کر کہتے ہیں کہ ٹینی ایک مصنف کے طور پر اسے اس روایت کو عبور کرنا چاہیے تھا اور اپنی نظر بروے کار لانی چاہیے تھی۔ کیری ایک مصنف کے طور پر ناکام نہیں تھا، مگر افریقا سے متعلق مصنف کی حیثیت میں انتہائی متنازع تھا۔ بہ ہر کیف جوائس کیری نے چنوا اچیبے کے اندر ایک بھونچال سا پیدا کر دیا۔ یہ بھونچال، ایک تخلیق کار کی بیداری کا نہیں تھا کہ اچیبے اس سے قبل ہی کہانی لکھنے کی طرف مائل تھا، تاہم اپنے قومی و ثقافتی وجود کی رمزوں کی طرف متوجہ ہونے کی زبردست تحریک ثابت ہوا۔ اچیبے اس واقعے کو یاد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اس [مسٹر جونسن] نے میری آنکھیں کھول دیں اور میں اس حقیقت سے آگاہ ہوا کہ میرا گھر حملے کی زد میں ہے اور میرا گھر محض ایک مکان یا قصبہ نہیں تھا، بلکہ ان سب سے بڑھ کر ایک بیدار ہوتی کہانی تھی، جس کی فضا میں میرے اپنے وجود نے پہلی مرتبہ اپنے حصوں بخروں کو ایک کل میں اور معنی مجتمع کرنا شروع کیا تھا۔ یہ وہ کہانی تھی جس سے میں اس لمحے آگاہ ہونے لگا تھا، جب میں لاری سے اترا تھا جو مجھے اوگڈی میں اپنے باپ کے مکان پر لائی تھی۔

اسی بحث کے دوران میں چنوا اچیبے کچھ بنیادی ادبی سوالات بھی اٹھاتے ہیں۔ واضح رہے کہ ان تمام سوالات کا تناظر نوآبادیات ہے۔ کوئی ادیب عظیم کیوں کر ہوتا ہے؟ اچیبے یہ سوال ہیمنڈ اور جیبلو کی اس رائے کے سلسلے میں اٹھاتا ہے کہ افریقا سے متعلق لکھنے والے کونارڈ، کیری، گرین اور ایلزبتھ باکسلے بڑے لکھنے والے ہیں۔ اچیبے کو اس رائے پر حیرت بھی ہے کہ ہیمنڈ اور جیبلو نے افریقا سے متعلق یورپیوں کی سیکڑوں کتابوں کے مطالعے کے بعد *The Africa That Never Was* کے عنوان سے کتاب لکھی اور اس نتیجے پر پہنچے کہ ان میں افریقا کا سٹیریوٹائپ تصور پیش کیا گیا ہے۔ اچیبے نے ان مصنفین کی یہ رائے بھی درج کی ہے: ''[افریقا سے متعلق اکثر کتابوں میں] افریقی اطوار، اداروں اور کرداروں پر نہ صرف نکتہ چینی کی گئی ہے بلکہ انھیں انسانی خصوصیات

سے محروم بھی دکھایا گیا ہے۔ غلاموں کی تجارت سے وابستہ مفاد نے تخفیفی ادب پیدا کیا اور چوں کہ غلاموں کی تجارت پر تنقید کی جارہی تھی، اس لیے افریقیوں سے متعلق انتہائی حقارت آمیز تحریریں اس [تجارت] کے ادبی حمایتیوں کی طرف سے سامنے آئیں۔'' لیکن یہی مصنفین اپنی کتاب کے ابتدائیے میں افریقا سے متعلق جدید یورپی لکھنے والوں (کونارڈ، کیری، گرین اور ہکسلے) کو بڑے قرار دیتے ہیں۔ کیوں کہ ''ان میں سے ہر ایک کا بے خطا منفرد اسلوب ہے جس کے ذریعے وہ ادبی رسمیات کو کام میں لاتے ہیں... نیز وہ افریقا سے متعلق رائج کلیشوں کے سوا باتیں کہتے ہیں۔ اس سب کو عمدگی سے پیش کرنے کی صلاحیت مستزاد ہے۔'' چنوا کے لیے اس رائے کو تسلیم کرنا ممکن نہیں۔ اس لیے کہ انھوں نے افریقا سے متعلق سٹیریوٹائپ تصورات اور کلیشوں کو پیش کیا ہے اور اس ضمن میں ہیمنڈ اور ہیبلو نے ڈنڈی ماری ہے۔ اچیبے کی جچی تلی رائے کہ جب کسی لکھنے والے کی فنکارانہ بصیرت سٹیریوٹائپ تصورات اور بغض کو راہ دیتی ہے تو برا ادب سامنے آتا ہے اور اس قسم کا ادب اس وقت دوگنا مکروہ ہوتا ہے جب اسے تفاخر کے ساتھ کسی قوم کے سامنے اس کی کہانی بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ بلاشبہ افریقا کے جدید یورپی مصنفین پر اچیبے کی تنقید اخلاقی ہے، مگر اسے وہ ادبی تنقید میں بدلنے کی سعی کرتے ہیں۔ مثلاً جدید مغربی تنقید کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ تخلیق کار کلیشوں سے آزادی حاصل کرے، دنیا کو دوسروں کی بجائے، اپنی اور انفرادی نظر سے دیکھے، مگر مذکورہ مصنفین نے خود اپنے تنقیدی اصولوں کی پیروی نہیں کی، انھوں نے افریقا کے لوگوں کو اسی طرح انسانی مرتبے سے کم تر بنا کر پیش کیا جس طرح انھوں نے یورپی زبانوں میں پڑھا اور سنا۔ یہی بات ان ادبا کی عظمت میں حائل ہے۔

اچیبے کو اس حقیقت سے انکار نہیں کہ فکشن کی ایک غیر معمولی بیانیاتی طاقت ہے۔ چوں کہ یہ طاقت ہے، اس لیے اسے کسی بھی دوسری طاقت کی طرح بروے کار لایا جا سکتا ہے۔ ''بالآخر میں نے سمجھنا شروع کیا۔ ایک ایسی شے ہے جسے بیانیے پر مطلق طاقت واختیار کہنا چاہیے۔ جو لوگ اپنے لیے یہ اختیار حاصل کر لیتے ہیں، وہ دوسروں کے بارے میں جہاں اور جس طرح چاہیں دل نشیں کہانیاں تیار کر لیتے ہیں۔ جس طرح بدعنوان آمریتوں میں ہوتا ہے جس میں دوسروں پر حسب ضرورت طاقت استعمال کر کے کچھ بھی کیا جا سکتا ہے؛ احتجاجی ہجوم جمع جا سکتے ہیں۔ نائیجیریا میں انھیں کرائے کے ہجوم کہتے ہیں۔ کیا جوائس کیری نے کونارڈ کا ہجوم کرائے پر لیا؟'' اس ضمن میں بحث طلب نکتہ یہ ہے کہ کیا فکشن کی بیانیہ طاقت خود کسی قدر کی حامل ہے کہ نہیں؟ نیز آیا ادبی رسمیات یا ادبی ہیئتوں میں انسانی اقدار ہوتی ہیں کہ نہیں؟ اس ضمن میں پہلی بات یہ ہے کہ بیانیہ میں طاقت ہے، قدر نہیں۔ بیانیہ، اپنی اصل میں ایک تدبیر، اسلوب اور طور ہے، جب کہ قدر کا تعلق بیانیے کے موضوع سے ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ بیانیہ خود کسی خاص موضوع سے کوئی ناگزیر تعلق نہیں رکھتا۔ چناں چہ یہ امکان رہتا ہے کہ بیانیے کی طاقت کو کسی قدر کے استحکام یا پامالی کے لیے بروے کار لایا جا سکے۔ (فی الوقت اقدار کے اضافی ہونے سے بحث نہیں) ۔جب کونارڈ قلب ظلمات میں افریقی لوگوں کا ایک ذلت آمیز تصور پیش کرتے ہیں تو وہ بیانیہ کی طاقت کو افریقی شناخت کے انہدام کا ذریعہ بناتے ہیں۔ اس سے ہمیں ایک بات کو سمجھنے میں مدد ضرور ملتی ہے کہ فکشن نگار بیانیے کی طاقت اور موضوع رقدر میں سے ایک کو زیادہ اہمیت ضرور دیتا ہے۔ جب بیانیے کی طاقت مقدم ہوگی تو لازماً یہ طاقت کی ان حقیقی یا طاقت کی آرزومند صورتوں کی حلیف بنے گی جو فکشن نگار کے زمانے میں، اس کی ثقافت میں کارفرما ہوں گی۔ فکشن اور زندگی کا یہ ایسا تعلق ہے جسے عام طور پر نظر انداز کیا گیا ہے۔ خود اردو فکشن میں اس امر کی کئی مثالیں ہیں۔ مثلاً نذیر احمد کے ناول انیسویں صدی کے آخر کی' یورپی طرز پر اصلاح معاشرت کے ڈسکورس' کی صورت رونما ہونے والی طاقت کے حلیف بنتے ہیں۔

اچیبے کے یہاں یورپ کے خلاف مزاحمت ضرور موجود ہے مگر وہ جگہ جگہ افریقا رپورپ کی ثنویت سے دامن چھڑانے کی سعی بھی کرتے ہیں۔ مابعد نو آبادیاتی مطالعات میں ہمیں نقادوں کا ایک گروہ ایسا ملتا ہے جو یورپ رافریقا یا یورپ رایشیا کی ثنویت کا شدت سے قائل ہے۔ اس کی نظر میں ہر یورپی مصنف، یورپی استعماریت کا حلیف ہے، جس کا صاف مطلب ہے کہ یورپی ادیب اپنی اوّل وآخر شناخت اپنے نسلی، لسانی، تاریخی سیاق میں کرتا ہے، یا اس کا تخلیقی ضمیر عام انسانی امنگوں، صورت حال کے بجائے اپنی ریاست کی سیاسی پالیسیوں کا تابع فرمان ہوتا ہے۔ نیز ثنوی فکر ہر یورپی مظہر کی تفہیم افریقی رایشیائی مظہر کی نقیض کے طور پر کرتی ہے۔ یورپ اگر روشن خیالی کا نمائندہ ہے تو ایشیا رافریقا عقل دشمن اور توہم پرست ہے۔ چناں چہ یہ ثنوی فکر، روشن خیالی اور جدیدیت کو خالص مغربی ثقافتی مظاہر قرار دے کر نہ صرف مسترد کرے گی، بلکہ ایشیائی رافریقی ثقافت

میں ان کے متبادل کے طور پر ایسی مثالیں ڈھونڈے گی جو ایک طرح کی مابعد الطبیعیاتی مزاج کی حامل ہوں گی اور روشن خیالی و جدیدیت کی نقیض ہوں گی۔ اس طور عمومی فکر خود اپنے منشا یعنی ردِ نوآبادیاتی مقصد کے برعکس در پردہ نوآبادیاتی ایجنڈے کی تکمیل کرے گی۔ اس امر کا احساس چنوا اچیبے کے یہاں موجود ہے، اس لیے وہ اپنے خطبات میں یورپ بہ مقابلہ افریقا کا حتمی زمرہ و فکر قائم نہیں ہونے دیتے۔ وہ اس مؤقف کے حامی ہیں کہ محض یورپی ادیب ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ جب بھی افریقا سے متعلق لکھے گا تو اسی سٹیریوٹائپ کا شکار ہوگا جسے استعماری فکر نے تشکیل دیا۔ وہ ایک تخلیق کار کے سلسلے میں یقین رکھتے ہیں کہ وہ ایک مؤقف کا حامل ہوگا۔ وہ ڈیلن ٹامس کے اس قول کے حامی ہیں کہ ''ایک فن کار بس ایک مؤقف اختیار کر سکتا ہے: وہ راست باز اور کھرا ہو۔'' یہ مؤقف ہی اسے اپنی نسلی، لسانی، قومی، ثقافتی شناخت سے بالا تر ہونے اور ایک انسانی شناخت قائم کرنے کی تحریک دیتا ہے۔ عملاً یہ مؤقف اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کوئی تخلیق کار اپنے ماضی کے اثرات کے سلسلے میں تنقیدی آگاہی اور ان سے بلند ہونے کی صلاحیت کا مظاہرہ نہ کرے؛ وہ اصل اور سٹیریوٹائپ میں امتیاز قائم نہ کر لے۔ اچیبے اس ضمن میں ایف جے پیڈلر (جو ممتاز برطانوی بیوروکریٹ تھے اور افریقا میں مقیم رہے) کی کتاب *West Africa* (۱۹۵۱) کی مثال دیتے ہیں جس میں اس گم راہ کن بات سے انکار کیا گیا ہے کہ افریقی اپنے لیے بیویاں خریدتے ہیں۔ پیڈلر کی یہ بات بڑی حد تک جوائس کیری کے ناول میں درج اس واقعے کے رد میں لکھی گئی ہے جس میں ہیرو جونسن اپنے لیے ایک مقامی لڑکی باموخریدتا ہے۔ پیڈلر یہ بھی کہتا ہے کہ افریقیوں کو اپنی کہانیاں خود لکھنی چاہییں۔ اچیبے اسی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے اموس طوطولا کے ناول *The Palm-wine Drinked* (۱۹۵۲) پر ڈیلن تھامس اور ایلزبتھ ہکسلے کے ردِ اعمال کا مطالعہ پیش کرتے ہیں۔ ویلش مصنف نے اس ناول کو ''شستہ، راست، مضبوط، بانکا، خالص اور پر لطف'' قرار دیا جب کہ انگریز مصنفہ نے اسی ناول کو نہ صرف ایک لوک کہانی کہا جس میں بے ڈھنگی، مسخ شدہ شاعری کی بھرمار ہے، بلکہ اس کی بنیاد پر افریقی ادب سے متعلق ایک عمومی نتیجہ بھی اخذ کر لیا کہ اصل افریقی ادب کبھی دل چسپ، اعلیٰ یا سنجیدہ نہیں ہوا، اسی لیے یہ شاید ہی کبھی عظمت حاصل کر سکے۔ یہ ایک لطف مزاح کے ساتھ خوف، اذیت اور بزدلی کی گہرائیوں کو کھوجتا رہے گا۔ ایک ہی ناول سے متعلق دو یورپیوں کی متضاد آرا کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک مصنف نے کھرا مؤقف اختیار کیا، جب کہ دوسری مصنفہ نے اپنے تخلیقی ضمیر کو اپنی ریاست کی استعماری پالیسی کا وفادار بنایا۔ تنقیدی محاورے میں وہ اپنے ماضی کے اثرات کے سلسلے میں تنقیدی آگاہی اور بالیدگی کا مظاہرہ نہ کر سکیں۔

اچیبے نے اسی ضمن میں لندن میں مقیم کچھ افریقی طلبا کے طوطولا کے ایک دوسرے ناول *My Life in the Bush of Ghost* (۱۹۵۴) پر ردِ عمل کا ذکر بھی کیا ہے۔ ان طلبا نے ویسٹ افریقا نامی رسالے میں رائے دی کہ افریقی مصنفین خراب انگریزی میں لوک کہانیاں پیش کر رہے ہیں۔ ان میں سے اکثر نے اس ناول کو پڑھا تک نہیں تھا۔ اچیبے انھیں 'جڑوں سے اکھڑے لوگوں کی نفسیات' کا حامل قرار دیتا ہے۔ اس قسم کے لوگوں میں نہ صرف اپنی ثقافتی شناخت کے سلسلے میں ناقابلِ فہم ندامت پائی جاتی ہے بلکہ بہ قول اچیبے ان میں عزتِ نفس باقی نہیں رہتی۔ وہ خود کو یورپی نظر، معیار و ذوق سے دیکھتے، کم تر پاتے اور شرمندہ ہوتے ہیں۔ ان لوگوں میں ان تمام علامتوں کے سلسلے میں ندامت و حقارت کے ملے جلے جذبات پائے جاتے ہیں جو انھیں ان کا ماضی یاد دلائیں۔ ایک حد تک یہ لوگ بھی عمومی فکر کے اسیر ہوتے ہیں۔ وہ ہر مقامی شے، مظہر کو، یورپی شے و مظہر کے مقابلے میں کم تر خیال کرتے ہیں۔ وہ یورپ و افریقا کے عمومی مخالف جوڑے سے اپنے ذہن کو آزاد نہیں کر سکتے، اس لیے اپنی افریقی ثقافتی شناخت کا تصور اس اساطیری مظہر کے طور پر کرتے ہیں جسے عقلیت پسند یورپ وحشیانہ عہد کی یادگار قرار دیتا ہے۔ چناں چہ قبل نوآبادیاتی عہد کی افریقی کہانیوں کو دورِ وحشت کی پیداوار سمجھ کر ان سے حقارت آمیز گریز اختیار کرتے ہیں۔ اچیبے اسی ضمن میں وی ایس نائپال کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ نائپال کو ہندوستان میں پسماندگی اور غلاظت ہی نظر آتی ہیں اور وہ اپنے آبائی وطن ٹرینیڈاڈ سے متعلق بے دھڑک کہتے ہیں کہ ''میں بندر (جو جمہور کے لیے ایک محبت بھرا لفظ ہے) کو کتاب پڑھتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ اب میری کتابیں ٹرینیڈاڈ میں نہیں پڑھی جاتیں۔ یہ لوگ محض جسمانی زندگی بسر کرتے ہیں جو میرے لیے نفرت انگیز ہے۔'' نائپال نے افریقا سے متعلق بھی ایک ناول *A Bend in the River* کے نام سے لکھا ہے۔ اچیبے کے نزدیک یہ ناول افریقیوں کے بارے میں ضرور ہے، افریقیوں کے لیے نہیں ہے۔ اس ضمن میں وہ طوطولا اور اچیبے کی صف میں نہیں، جوائس کیری، کونارڈ اور ایلزبتھ ہکسلے کی صف

میں کھڑا ہے۔ ہر چند اچیبے کے خیال میں مقامی آدمی ہی بہتر طور پر مقامی کہانی لکھ سکتا ہے، مگر ضروری نہیں کہ ہر مقامی مصنف استعماری کہانیوں کی جوابی کہانی لکھ سکے۔ بالکل ااسے ہی جیسے ہر یورپی مصنف ضروری نہیں کہ افریقا سے متعلق یورپی سٹیریوٹائپ کا شکار ہو۔ اچیبے ایک مرتبہ پھر اس بات پر زور دیتے ہیں کہ روایت اخذ کی جاتی ہے؛ یہ محض نسلی، لسانی، ثقافتی تعلق سے از خود حاصل نہیں ہوتی۔ اچیبے نے اسی ضمن میں آر کے نارائن کا ذکر بھی کیا ہے جنھیں ہندوستان میں سیکڑوں نئی کہانیاں نظر آتی ہیں، جب کہ نائپال کو سیکڑوں غدر۔ دونوں کا فرق، دونوں کے اخذِ روایت اور موقف کا ہے۔ نیز آر کے نارائن ہموی فکر سے آزاد ہے، اس لیے اسے ہندوستان میں وہ کہانیاں نظر آتی ہیں جو ہندوستان میں جنم لے سکتی ہیں، جب کہ نائپال ہندوستان کا تصور یورپی استعمار کی تشکیلات کی رو سے کرتا ہے۔

وطن اور جلا وطنی میں اچیبے جس بحث کی طرف بار بار رجوع کرتے ہیں، وہ یہ ہے: 'آدمی کہانی کہنے والا جانور ہے'۔ آدمی سفید فام ہو یا سیاہ فام، کہانی اس کے ثقافتی وجود کے اثبات و شناخت کا اہم ترین اور شاید مستند ذریعہ ہے۔ یہ درست ہے کہ آدمی کی شناخت کے اس فرضیے کی مدد سے اچیبے اپنے کہانی کار ہونے کی جبلت کی تشریح کرتے ہیں، مگر یہ بات بھی اتنی ہی درست ہے کہ ان کے کہانی کار ہونے کی جبلت ان کے کو آبادیاتی ماضی میں جڑیں رکھتی ہے۔ یہ محض ایک شخص کی جبلت نہیں، ایک افریقی شخص کی جبلت ہے۔ اسی لیے اچیبے یہ تسلیم کرنے کو تیار نظر نہیں آتے کہ کہانی 'معصوم' ہوتی ہے۔ اس کا لازماً تاریخی و ثقافتی کردار ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں: ''اگرچہ فکشن افسانوی ہوتا ہے، مگر یہ سچا یا باطل بھی ہوسکتا ہے، خبر کے سچے یا جھوٹے ہونے کے مفہوم میں نہیں، بلکہ اپنی بے غرضی، منشا اور سلیت و راست بازی کے ضمن میں۔'' دوسرے لفظوں میں وہ آدمی کو محض کہانی کہنے والا جانور نہیں، ایک ذمہ دار جانور قرار دیتے ہیں۔ ہر کہانی، اپنی رسمیات سے لے کر کرداروں، واقعات کی ترجمانی تک اپنے ثقافتی پس منظر میں جڑیں رکھتی ہے، مگر کہانی کار کو آگاہ ہونا چاہیے کہ اس کی کہانی کہاں کس ثقافتی سٹیریوٹائپ کی ترجمانی کر رہی ہے اور کہاں ایک بے غرضانہ موقف اختیار کر رہی ہے؟ اچیبے کے یہاں بے غرضانہ موقف سے مراد ایک ایسی نظر ہے جو سچ اور تشکیل میں فرق کر سکے اور کسی تشکیل کی اندھی ترجمانی سے گریز کرے۔ وہ اکثر سیدھی سادی بات کہتے ہیں۔ مثلاً جون لاک (جو ایک انگریز کپتان تھے) کی مثال دیتے ہیں جس نے ۱۵۶۱ میں جنوبی افریقا سے متعلق اپنے سفرنامے میں نیگرو لوگوں کے بارے میں لکھا کہ ''یہ ایسے لوگ ہیں جو وحشیوں کی طرح رہتے ہیں؛ خدا، آئین اور مذہب میں یقین نہیں رکھتے... جن کی عورتیں سب کی سانجھی ہیں کیوں کہ وہ شادی نہیں کرتے اور نہ ہی عصمتِ نسواں کو مانتے ہیں۔'' اچیبے اس رائے کو افریقا کا سچ نہیں، ایک ایسی تشکیل / روایت کہتے ہیں جس کی پیروی یورپ کے اکثر لکھنے والوں نے کی۔ سولھویں صدی سے بیسویں صدی کے نصف تک اس تشکیل کو افریقا کا سچ بنا کر پیش کرنے کا سبب کیا تھا؟ اچیبے کے نزدیک، یہ سبب ان تمام اقدامات کو جواز فراہم کرنا تھا، جو سفید فام لوگوں نے افریقیوں کو غلام بنانے سے لے کر ان کی زمینوں پر قابض ہونے کے سلسلے میں کیے۔ یورپی استعماری ذہنیت کا ساتھ یورپی تخیل نے دیا۔ غلام بنانا، ایک قبیح عمل تھا؛ اس کی قباحت کا احساس کہیں نہ کہیں ان استعمار کاروں کو بھی تھا اور ان کے ضمیر پر بوجھ پڑتا تھا۔ کہانی کاروں نے افریقیوں کو وحشی، مذہب، اخلاق و تہذیب سے عاری قرار دے کر اپنے سیاسی و انتظامی زعما کو ضمیر کے بوجھ سے آزاد کیا۔ آخر ایک وحشی کو غلام نہ بنایا جائے تو کیا کیا جائے!

کہانی کا جواب کہانی ہے۔ اچیبے کے اس خیال کے ضمن میں غالب کا ایک فارسی شعر یاد آتا ہے:

جز سخن کفر ے وایمانے کجا ست
خود سخن از کفر و ایماں می رود

کفر و ایماں جیسی دو متضاد چیزیں اپنی اصل میں باتوں ہی میں پائی جاتی ہیں اور خود باتیں بھی کفر و ایماں کو ثابت کرنے کے لیے کی جاتی ہیں۔ گویا کفر و ایمان کی، استعمار اور ردِ استعمار کی ساری جنگ سخن / کہانی میں لڑی جاتی ہے۔ کفر / استعمار نے سٹیریو ٹائپ پر مبنی بیانیے گھڑے، ان کے ردّ میں مقامی باشندوں / ایمان نے بیانیے وضع کیے۔ اسے اچیبے کہانیوں کا توازن بھی کہتے ہیں۔

جس زمانے میں ایلزبتھ ہکسلے اپنی کتاب *White Man's Country* شایع کر رہی تھیں، انھی دنوں، لندن سکول آف اکنامکس و پولیٹیکل سائنس کے ممتاز پروفیسر برونسلا میلنوسکی کے شاگرد جومو کینیاتا اپنے ہم وطن کیکیو لوگوں سے متعلق اپنا مقالہ *Facing Mout Kenya* شایع کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔ جومو کینیاتا نے اپنی کتاب میں گوروں اور کالوں کے تعلق سے ایک مختصر حکایت بہ عنوان 'جنگل کے شرفا' شامل کی، جو دراصل ایک سیاسی طنز ہے۔ یہ حکایت ہکسلے کا جواب ہے۔ یہ حکایت

دلپذیر سننے سے تعلق رکھتی ہے۔

ایک آدمی نے اپنے دوست ہاتھی کو بارش میں بھیگتے دیکھا تو اسے اپنی جھونپڑی میں سونڈ دھرنے کی اجازت دے دی۔ ہاتھی نے آدمی کی منشا اور احتجاج کو بالائے طاق رکھتے ہوئے، رفتہ رفتہ اس چھوٹی سی جھونپڑی میں اپنے جسم کے باقی حصوں کو دھکیلنا اور آرام پہنچانا شروع کر دیا، یہاں تک کہ ہاتھی جھونپڑی میں آدمی اس سے باہر تھا۔ دونوں میں فساد کی خبر پاتے ہی جنگل کا بادشاہ آن پہنچا۔ اس نے فی الفور ایک شاہی کمیشن بٹھایا کہ آدمی کی شکایت کی تحقیق کرے۔ لیکن اس کمیشن میں عزت مآب ہاتھی کی کابینہ کے ارکان شامل تھے، جیسے جناب گینڈا، جناب بھینسا، اور عزت مآب روباہ کمیشن کی سربراہ تھیں۔ کمیشن ہاتھی اور آدمی دونوں سے ملا؛ مگر صرف ہاتھی کو گواہ پیش کرنے کی اجازت دی۔ یہ گواہ لگڑ بگا تھا۔ آدمی کی گواہی اس لیے نہ سنی گئی کہ اس نے خود کو متعلقہ حقائق کے بیان تک محدود نہیں رکھا تھا۔ کمیشن نے اپنا فیصلہ سنانے سے پہلے وقفہ کیا اور اس وقفے میں ہاتھی کی ضیافت میں شرکت کی۔ کمیشن نے فیصلہ دیا کہ آدمی کی جھونپڑی میں خالی جگہ موجود تھی اور ہاتھی جائز طور پر یہ خالی جگہ اپنے مصرف میں لایا؛ ہاتھی کا یہ عمل آخر لامر آدمی کے لیے اچھا تھا۔ کمیشن نے آدمی کو اجازت مرحمت کی کہ وہ کوئی ایسی جگہ تلاش کر لے جو اس کے لیے زیادہ مفید ہو اور وہاں جھونپڑی تعمیر کر لے۔ اپنے طاقت ور پڑوسیوں کی دشمنی سے ڈر کر آدمی نے یہ فیصلہ قبول کر لیا۔

آدمی نے جو اگلی جھونپڑی بنائی، اسے جناب گینڈے نے ہتھیا لیا اور اس کی چھان بین کے لیے ایک اور شاہی کمیشن بٹھایا گیا۔ یہ سلسلہ جاری رہا، یہاں تک کہ جنگل کے تمام بڑے آدمی کی بنائی ہوئی جھونپڑیوں میں بس گئے۔

بالآخر جب آدمی کو یقین ہو گیا کہ اسے جانوروں اور ان کے شاہی کمیشنوں سے انصاف نہیں ملے گا تو اس نے معاملات خود اپنے ہاتھوں میں لینے کا فیصلہ کیا۔ اس نے کہا: کوئی شے ایسی نہیں جو زمین کو کچلتی ہو اور اسے چھل جھانسے سے پھانسا نہ جا سکے یا دوسرے لفظوں میں آپ کسی کو ایک وقت میں بے وقوف بنا سکتے ہیں، ہمیشہ کے لیے نہیں۔ چناں چہ اس نے اپنی تدبیر پر عمل کرنا شروع کیا۔ اس نے ایک عظیم الشان جھونپڑی تعمیر کی۔ حسب توقع جنگل کے تمام جانور اس پر قبضے کی خاطر دوڑے۔ جب وہ لڑ رہے تھے تو آدمی نے جھونپڑی کو آگ لگا دی۔ جھونپڑی مع جنگل کے تمام شرفا کے خاکستر ہو گئی۔ تب آدمی یہ کہتے ہوئے اپنے گھر کی طرف چل پڑا کہ امن مہنگا ہے مگر اس کی قدر، لاگت سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اس کے بعد وہ ہمیشہ خوش و خرم جیا۔

یہ حکایت نو آبادیاتی تاریخ اور اس کے سلسلے میں مقامی لوگوں کے ردعمل کی تمثیل بھی ہے۔ جومو کینیاتا کے پاس زندگی کا متنوع تجربہ تھا: وہ ایک معمولی گھریلو ملازم رہا، ایک گورے کا باورچی رہا؛ سٹور کلرک رہا؛ اور ایک ممتاز یورپی ادارے میں ایک نامور ماہر بشریات کا طالب علم رہا اور ایک پرجوش قوم پرست بنا؛ جیل کاٹی اور سفید فاموں کے مظالم سہے۔ اس حکایت کے ذریعے اس نے نہ صرف افریقی استعمار زدگی کا بیانیہ وضع کیا بلکہ استعماریت سے عہد برا ہونے کا وژن بھی خلق کیا جو ایک پرتشدد تدبیر سے عبارت ہے۔ لہٰذا یہ اتفاق نہیں کہ وہ ۱۹۶۳ میں نو آزاد ملک کینیا کا پہلا وزیر اعظم بنا۔ اچیبے اس کہانی کو سفید فاموں کی افریقا سے متعلق کہانیوں کے مقابلے میں افریقیوں کی اپنے لیے ایک جوابی کہانی کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ (گو اچیبے اس طرح کے تشدد میں یقین رکھتے محسوس نہیں ہوتے جو مذکورہ طنزیے میں موجود ہے)۔ یہ اور دوسری کہانیاں، اچیبے کے اس یقین کو مزید پختہ کرتی ہیں کہ نو آبادیاتی قبضے کو جائز ثابت کرنے کی خاطر گھڑی گئی کہانیوں کے اثر کو کھنڈانے کا حل مقامی کہانیاں ہی ہیں۔ مقامی کہانیاں اس مقامی وجود کو گویا بنانے کی کوشش ہیں، جنھیں یورپی بیانیوں میں خاموش رکھا گیا۔ اس عمل کو وہ کہانیوں کے ذریعے حساب چکانا (Balance of Stories) اور سلمان رشدی کے لفظوں میں The Empire Writes Back کہتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ ایک ضرب المثل کا حوالہ دیتے ہیں کہ جب تک شیر خود اپنے مورخ پیدا نہیں کرتے، تب تک شکار کی کہانی، شکاریوں کی عظمت کے گن گاتی رہے گی۔ اچیبے کی اپنی کہانیاں اس ضرب المثل کی عملی تفسیر ہیں۔

اپنے مورخ اور اپنے کہانی نویس پیدا کرنے کا عمل صرف اپنے گم شدہ اور مسخ شدہ ثقافتی وجود کی باز یافت نہیں، بلکہ اپنے ثقافتی ضمیر کی تشکیلِ نو ہے۔ دوسرے لفظوں میں جوابی کہانیاں، محض پرانی کہانیاں نہیں جنھیں انگریزی، فرانسیسی یا اپنی مقامی زبان میں لکھا گیا ہو۔ اگرچہ ایک حد تک اچیبے کے خیالات سے یہ گمان ضرور گزرتا ہے۔ اس کا سبب افریقی نو آبادیات ہے۔ برصغیر کے برعکس افریقا میں مقامی لوگوں کو غلام بنایا گیا، ان سے زمینیں ہتھیا کر، انھیں بے دخل کر کے وہاں گوروں کو بسایا گیا۔ نیز افریقا میں تعلیم، سیاست، شہری تنظیم کے وہ ادارے

نہیں تھے جو انگریزوں کے آنے سے پہلے برصغیر میں موجود تھے۔ محمود ممدانی کے بہ قول نو آبادیاتی مورخوں نے دراصل دو حاشیے کھینچے تھے۔ ''ایک ظاہر اور دوسرا پوشیدہ۔ افریقا کو اس حاشیے پر رکھا گیا جو پوشیدہ تھا۔'' (اچھا مسلمان، برا مسلمان، ترجمہ سہیل ہاشمی، قمر آزاد ہاشمی، ص ۳۰)۔ محمود ممدانی سیل یونیورسٹی کے کرسٹوفر ملر کا حوالہ بھی دیتے ہیں جس کے مطابق یورپی تاریخوں میں افریقا کو ''ایک خالی اندھیرا'' لکھا گیا، کیوں کہ یہاں سے نہ تو عظیم تحریریں ملیں نہ قدیم و عظیم عمارات۔ اس کے لیے مصر و حبشہ کو افریقی شناخت کے بیانیے سے باہر رکھا گیا۔ بلاشبہ افریقا (مصر کے بغیر بھی) ایک حقیقی، زندہ مقامی ثقافت کا حامل تھا؛ اس کے پاس اپنی کہانیاں تھیں اور زندگی، سماج، خدا، کائنات سے متعلق سارا فلسفہ انھی میں مضمر تھا۔ سائنس و فلسفے کی روشن روایت کی بنا پر تفاخر پسند یورپ کے لیے یہ کہانیاں ''ایک خالی اندھیرا'' ہوں گی، مگر افریقیوں کے لیے ان میں وہ ساری روشن بصیرت مضمر تھی جو اپنے طریقے سے زندگی بسر کرنے کے لیے درکار ہوتی ہے۔ لہٰذا اگر اچھے کہانیوں کو ردِ نو آبادیات کو مؤثر ہتھیار قرار دیتے ہیں تو وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ یہ کہانیاں خود پر مسلط کردہ حاشیائی مقام کے خلاف احتجاج ہیں۔ جو ثقافت کہانیاں تخلیق کر سکتی اور ان میں اپنی حیاتِ اجتماعی کا وژن سمو سکتی اور اس وژن کو اپنی زندگی کی راہ نما بنا سکتی ہے، اس کے لیے ایک تاریک حاشیے کا تصور پرلے درجے کی بد مذاقی ہے۔ بایں ہمہ نہ تو اچھے نے، نہ دوسرے افریقی مصنفین نے قدیم افریقی کہانیوں کا ان کی قدیمی ہیئت کے ساتھ احیا کیا؛ انھوں نے افریقا سے متعلق ناول لکھے اور اپنے مضامین میں قدیم اساطیری و نیم تاریخی کہانیوں کی تعبیرِ نو کی۔ ان کے ناولوں کا موضوع افریقا ہے؛ اس کی قبل نو آبادیاتی، نو آبادیاتی اور بعد از نو آبادیاتی تاریخ و ثقافت ہے۔ یہ ناول اکثر ان لوگوں نے لکھے جو جلاوطن تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ جلاوطنی سابق ایشیائی و افریقی نو آبادیاتی ممالک اور مغرب کے متعدد ادیبوں کا مسئلہ ہے۔ اگرچہ نو آبادیاتی ملکوں اور یورپ کے ادیبوں کی جلاوطنی کے اسباب مختلف ہیں، مگر ایک بات ان میں مشترک نظر آتی ہے کہ ان کا وطن ان کی تحریروں میں ایک قسم کی 'آرکی رائٹنگ' کی صورت موجود ہے؛ گھر واپسی یعنی Home Coming کی آرزو سے ان کے تخیل میں ایک الاؤ سا روشن رہتا ہے۔ وہ ایک اجنبی ملک کا آب و دانہ کھاتے ہیں، مگر ان کی روح کے چاک پر اس مٹی سے نئی نئی صورتیں خلق ہوتی رہتی ہیں جہاں ان کی آنول نال گڑی ہوتی ہے۔ جدائی اور کھوئی ہوئی جنت کا احساس، جلاوطنی کا عمومی جذباتی تجربہ ہے۔ ظاہر ہے یہ تجربہ خود اپنے وطن میں رہنے بسنے کے تجربے کی نقل ہے، نہ اس کے مماثل۔ وطن کے جنت ہونے کا ادراک، وطن میں نہیں جلاوطنی میں ہوتا ہے۔ لہٰذا جلاوطنی ایک ایسا تناظر ثابت ہوتی ہے جو وطن کا ایک نیا معنی روشن کرتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں جلاوطنی میں یادداشت کے ملبے سے، اگر ایک طرف وطن کی نرول بازیافت ہوتی ہے، خاص طور پر وطن کے اس تصور کی جسے مسخ کیا گیا ہوتا ہے، تو دوسری طرف ایک جنت نما وطن کے تصور کی تشکیل بھی ہوتی ہے۔ جلاوطن ادیب کا تخیل صرف ماضی کے مانوس خطے ہی میں نہیں پہنچتا، ایک مثالی خطے کا منفرد تصور بھی تخلیق کرتا ہے۔ (تاہم یہ بات ان ادیبوں پر صادق نہیں آتی جو اپنے چھوڑے ہوئے گھر کو استعمار کی نظر سے دیکھتے اور اسے پس ماندہ، غیر ترقی یافتہ اور توہمات میں لپٹی ایک تلخ حقیقت کے طور پر دیکھتے ہیں)۔ جلاوطن ادیب اکثر زبان غیر میں اپنی کہانی لکھتے ہیں۔ اس سے ان کے یہاں دوری اور قربت، اجنبیت اور مانوسیت، کے متضاد احساسات پیدا ہوتے ہیں۔ مگر یہی وہ تضاد اور پیراڈاکس ہے جس سے ان اکا ادب اپنی خاص معنویت حاصل کرتا ہے۔ تاہم چوں کہ یورپی اور ایشیائی و افریقی ادیبوں کے وطن رگھر کی تاریخ الگ الگ ہے، اس لیے انھوں نے اپنے وطن کی طرف واپسی کے تجربے کو اپنی تحریروں میں الگ طور پر پیش کیا ہے۔ نو آبادیاتی ممالک کے جلاوطن ادیب، اپنے وطن کا تصور نو آبادیاتی تجربے کے بغیر نہیں کرتے؛ وہ ایک طرف اس تجربے کو اپنے وطن کی جنت کے غارت کرنے کا سبب قرار دیتے ہیں تو دوسری طرف یہی تجربہ انھیں اس جنت کی تخیلی بازیافت کی زبردست تحریک بھی دیتا ہے۔ یہاں پہنچ کر ہم یہ سمجھنے کے قابل ہو جاتے ہیں کہ چنوا اچیبے نے آخر اپنے خطبات کا عنوان وطن اور جلاوطنی کیوں رکھا؟ صرف اس لیے نہیں کہ وہ امریکا میں مقیم ہے، بلکہ اس لیے بھی کہ انگریزی میں لکھنے، انگریزی ادبیات کی تدریس میں مشغول رہنے کی بنا پر وہ ذات کی سطح پر بھی جلاوطنی کا تجربہ کر رہا ہے۔ اپنی کہانی کسی اور کی زبان میں لکھنا، خاص طور پر اس زبان میں جس کے ادیبوں کی ایک بڑی تعداد نے زخم بھی دیے ہوں، اپنے وطن سے ایک اور طرح کی جدائی اور کھوئے ہونے کا احساس پیدا کرتی ہے۔ یہ گھر واپسی کی ایک ایسی اوڈیسی ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتی۔ کیا کوئی ایسی جلاوطنی ہے جو وطن کی جنت کی یاد دل سے مٹا دے!

ایٹمی حملے کے بعد کا منظر

ڈاکٹر کوثر محمود/راولپنڈی

آجکل پاکستان اور ہندوستان کے درمیان بداعتمادی عروج پر ہے اور مختلف حیلے بہانے سے جنگی جنون کو ہوا دی جارہی ہے۔ ذرائع ابلاغ پر کئی ''دانش ور'' اور سیاسی لیڈر جوشِ جذبات میں جوہری ہتھیاروں کو استعمال کی بات کرتے ہیں جیسے ایٹمی ہتھیار عام بندوق یا توپ کی طرح کوئی چیز ہوں۔ خاکم بدہن، جوہری جنگ کی صورت میں کیا ہوگا اس کے بارے میں ذرا بھی شعور نہیں پایا جاتا لیکن ان حالات میں ادیبوں شاعروں، اصحابِ فکر و دانش کی خاموشی قبیح ترین جرم سمجھی جائے گی۔

سٹان فورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر پال ارلک (Prof. Paul Ehrlic) خبردار کرتے ہیں کہ (جوہری جنگ) میں جیتنے والا کوئی نہ بچے گا۔ ۱۰۰ میگا ٹن کے دھماکے (جو رُوسی اور امریکی جوہری اسلحے کا محض ایک فیصد ہے؛ پاکستان، ہندوستان کے جوہری اسلحے کے بارے میں کوئی اعداد و شمار دستیاب نہیں۔ اس وقت دنیا میں لگ بھگ ۳۰ ہزار ایٹمی بم موجود ہیں۔ موجودہ بموں کے دھماکے کی قوت ہیروشیما پر گرائے گئے بم سے دس لاکھ گنا زیادہ ہے) سے اتنا گرد و غبار اُٹھے گا جو ۹۹% یا اس سے زیادہ سورج کی روشنی کو ہفتوں تک زمین پر پہنچنے سے روک دے گا۔

۱۹۵۴ء میں بکنی آٹول Bikni Atoll Pacific Ocean، میں ایک جزیرے پر ایک تجرباتی بم گرایا گیا گس کی قوت ۱۵ لاکھ ٹن تھی۔ دھماکے کے ۹۶ گھنٹے کے بعد ہوا میں ۱۹۰ کلومیٹر تک ۳ ہزار ریڈ کی تابکار شعاعیں موجود تھیں اور ۳۶۰ کلومیٹر تک ۳۰۰ ریڈز کی پیائش کی گئی۔ یاد رہے کہ کوئی بھی انسان ۶۰۰ ریڈز کی شعاع کاری برداشت نہیں کر سکتا؛ تقریباً نصف لوگ ۴۵۰ ریڈز پر مر جاتے ہیں، ۵۰ سے ۱۰۰ ریڈز کی شعاعیں انسان کے مدافعتی نظام کے لیے تباہ کن ثابت ہوتی ہیں۔ تابکاری سے شدید متاثرہ شخص پہلے ہفتے میں متلی، قے، بخار، بے ہوشی، پیچش، گلے کی بندش وغیرہ کا شکار ہو جاتا ہے اور ایک دو ہفتے کے اندر مدافعتی نظام کے کمزور پڑنے اور پانی اور غذائی کمی کا شکار ہو کر موت کے منہ میں چلا جاتا ہے۔☆☆

اگر پانچ ہزار سے دس ہزار میگا ٹن کا دھماکہ ہوا تو عالمی سطح پر بلیک آؤٹ ہو جائے گا کیونکہ گرد و غبار کے بادل سورج کی شعاؤں کو زمین پر پہنچنے سے روک دیں گے۔ جب زیریں احمر (Infra red rays) شعاعیں زمین پر نہیں پہنچیں گی (جو زمین پر گرمی کا سبب بنتی ہیں) تو چند ہفتوں کے دوران جون جولائی کے مہینوں میں بھی درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے نیچے گر جائے گا۔

انسانوں کی اکثریت فوری طور پر ہلاک ہو جائے گی دور دراز کے رہنے والے انسان بھوک اور پیاس سے مر جائیں گے کیونکہ تمام دریا، ندیاں اور جھیلیں جم جائیں گی۔ کھڑی فصلیں جل جائیں گی اور شمالی علاقوں میں بچ جانے والی فصلیں درجۂ حرارت گرنے سے تباہ ہو جائیں گی کیونکہ روشنی کے نہ ہونے سے ضیائی تالیف (Photosynthesis) کا عمل پودوں میں شروع نہ ہو سکے گا۔ انسان اور جانور خوراک نہ ہونے کی وجہ سے فاقوں مر جائیں گے۔ پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پودے تو چلو پھر بھی امکان ہے کہ بیجوں سے دوبارہ نکل آئیں گے لیکن جانور اور انسان دوبارہ کیسے پیدا ہوں گے؟ اور اگر پانی تمام پائپوں میں جم جائے تو پانی کے حصول کے لئے دریا یا ندی تک پہنچنا کتنا دشوار ہوگا؟ کتنی پیاس ہوگی؟☆!

ہیروشیما اور ناگاساکی کی تباہی پر ایک نظر

دنیا نے پہلی مرتبہ ہولناک ایٹمی تباہ کاری کا مشاہدہ ۶ اگست، ۱۹۴۵ء کو جاپان کے شہروں، ہیروشیما اور ۹ اگست کو ناگاساکی میں کیا۔ ایک لاکھ چالیس ہزار لوگ ہیروشیما اور ۸۰ ہزار معصوم لوگ موت کے منہ میں چلے گئے؛ وہ لوگ کہ جو براہِ راست کسی جنگ میں شریک نہ تھے۔ تقریباً آدھے لوگ تو فوراً ہلاک ہو گئے باقی آدھے لوگ شدید زخموں، جلنے سے، تابکاری کے اثرات اور بھوک پیاس کی شدت سے مر گئے۔ زندہ بچ جانے والوں کی حالت مردوں سے بدتر تھی کیونکہ تمام ہسپتال تباہ ہو چکے تھے ۹۰ % ڈاکٹر اور ۹۳% نرسیں بھی ہلاک ہو چکی تھیں۔ آپ اُس ماں کے دکھ اور کرب کو محسوس کریں جو خود بھی شدید زخمی ہے اور اپنے جلے ہوئے بچے کو ہاتھوں میں اُٹھا کر، بھوک اور پیاس سے بے حال، تباہ شدہ ہسپتال کے سامنے مرے ہوئے ڈاکٹروں کے درمیان کسی مسیحا کی منتظر ہے! اس کی مدد گیری کو کون آئے گا؟

ہیروشیما کی تباہی کے عینی شاہد، ٹوکیو یونیورسٹی میں ماڈرن فلاسفی کے پروفیسر، فادر جون اے سیمز بتاتے ہیں کہ، ''ایک دم تیز پیلی روشنی کا جھماکہ ہوا جو میگنیشیم کی روشنی کی طرح تھی، ان کے سر اور ہاتھوں سے خون نکل رہا تھا، باہر نکلنے کے تمام دروازے بند ہو چکے تھے۔ زیادہ تر لوگ شیشے کے

ٹکڑے لگنے سے زخمی ہوئے تھے، مائیں اپنے جلے ہوئے بچوں کو اُٹھا کر دیوانہ وار بھاگ رہی تھیں ....تمام کسانوں کے گھر جل رہے تھے....'' ☆

ایک اور عینی شاہد، ایک گیارہ سالہ لڑکے ہیسا ٹوہیٹو نے اپنی یاداشتوں میں لکھا؛

''۵ اگست کی صبح ہم لوگ اپنے بھائی سے ملنے ہیروشیما گئے جو وہاں ایک کالج میں پڑھتا تھا۔ میرے بھائی نے ایک رات ہمارے ساتھ ہوٹل میں بسر کی۔ ۶ تاریخ کی صبح میری ماں (ہوٹل کے) دروازے کے پاس کھڑی تھی اور بل دینے سے پہلے ہوٹل کے مالک کے ساتھ بات کر رہی تھی اور میں ایک بلی کے ساتھ کھیل رہا تھا؛ تبھی نیلی سفید روشنی کا ایک جھماکہ دروازے میں سے اندر آ گیا۔ کچھ دیر بعد مجھے ہوش آ گیا لیکن ہر طرف اندھیرا تھا۔ ہوٹل کی دو منزلیں گر چکی تھیں اور میں ایک دیوار کے ساتھ ملبے تلے دبا ہوا تھا۔ اگرچہ میں نے رینگ کر نکلنا چاہا لیکن حرکت نہ کر سکا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور سوچنے لگا کہ میں مر رہا ہوں۔ تب میں نے سنا کہ میری ماں مجھے پکار رہی ہے۔ اُس کی آواز پر میں نے آنکھ کھولی اور شعلوں کو اپنی طرف رینگتے پایا۔ میں نے اپنی ماں کو آوازیں دیں۔ میری ماں نے کچھ جلتے تختے کھینچے اور مجھے بچا لیا۔ ہر شے اتنی بدل گئی تھی کہ میں دہشت زدہ ہو گیا۔ جہاں تک نظر جاتی تھی ہر طرف آگ لگی ہوئی تھی۔ قریب سے گذرتے ہوئے لوگوں کی جلد سرخ تھی جیسے اوپر سے اتاری گئی ہو۔ یہ لوگ چیخ رہے تھے؛ باقی سب مر چکے تھے۔ گلیوں میں پڑی لاشوں۔ تباہ شدہ گھروں اور کراہتے ہوئے زخمیوں کے باعث چلنا محال تھا۔ پتہ نہیں چلتا تھا کہ کیا کریں۔ میں مغرب کی طرف مڑا تو دیکھا کہ شعلے قریب آ رہے ہیں۔

پانی کے کنارے پہنچا تو لگا کہ میں اپنی ماں سے بچھڑ گیا ہوں؛ جل جانے والے لوگ دریائے کباشی میں چھلانگیں لگاتے اور پھر چیختے ہوئے باہر نکل آتے کہ پانی بھی گرم تھا۔ اُن سے تیرا نہیں جا رہا تھا اور وہ ڈوبتے ہوئے چلا رہے تھے۔'' ☆

ہیروشیما کی دو تہائی عمارتیں مکمل طور پر تباہ ہو گئیں تھیں، سینکڑوں جگہوں پر آگ لگ گئی اور اس آگ نے پھیلتے پھیلتے چار میل تک ہر شے کو جلا کر رکھ دیا۔ دس میل تک کھڑکیاں دروازے ٹوٹ گئے تھے اور اس دھماکے کے اثرات ۳۷ میل تک محسوس کیے گئے۔ دھماکے کے آدھے گھنٹے بعد سیاہ رنگ کا تابکار مادہ آسمان سے گرنا شروع ہو گیا جس نے ہر شے کو زہریلا بنا دیا۔

ریڈیو سٹیشن خاموش ہو گئے، ٹیلی گراف کی لائنیں جواب دے گئیں۔ ہیروشیما میں کسی بڑی تباہی کی افواہیں پھیلنے لگیں؛ قریبی ریلوے سٹیشنوں سے آمدہ پیغامات میں بتایا گیا کہ ہیروشیما میں کوئی بڑا دھماکہ ہو گیا ہے۔ تقریباً ۶۸۱ کلومیٹر دور دارالحکومت ٹوکیو میں فوجی جنرل ہیڈکوارٹر نے مقامی فوجی کمانڈ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی وہاں مکمل سکوت تھا۔ جاپانی اعلیٰ فوجی قیادت پریشان تھی کہ آخر ہوا کیا ہے کیونکہ ہیروشیما میں کوئی اسلحہ گولہ بارود کا بڑا ذخیرہ بھی نہیں تھا اور کسی بڑے فوجی حملے کی کوئی اطلاع بھی نہیں تھی۔

ایک جنرل سٹاف کے افسر کو حکم ملا کہ وہ فوراً ہیروشیما پہنچے۔ جب اُس نوجوان افسر کا طیارہ ہیروشیما سے ۱۶۰ کلومیٹر دور تھا تو پائلٹ نے عین دوپہر میں گرد وغبار کے ایک بڑے بادل کو دیکھا۔ تمام شہر جل رہا تھا۔ شہر میں ہوائی جہاز کے اترنے کی کوئی جگہ نہ تھی سو اس نے شہر کے جنوب میں کسی قریبی ایئرپورٹ پر اُتر کر حکامِ بالا کو صورتِ احوال سے آگاہ کیا۔

ٹوکیو میں عجیب وغریب افواہیں پھیل رہی تھیں۔ بم گرنے کے سولہ گھنٹے بعد امریکی صدر نے سرکاری طور پر اعلان کیا کہ ہم نے جاپان پر ایٹمی بم گرا دیا ہے اور اگر جاپان نے ہماری شرائط پر شکست تسلیم نہ کی تو اسے ایسے مزید حملوں کے لیے تیار رہنا چاہیے کہ جن کی نظیر اس سے دنیا نے نہیں دیکھی ہوگی۔

جاپانیوں نے ایٹم بم کے توڑ کے لیے ایک اعلیٰ سطحی کمیٹی بنائی جس کا پہلا اجلاس ۷ اگست کو ہوا۔ جاپانیوں کو اب تک یقین نہیں تھا کہ امریکہ نے ایٹمی حملہ کیا ہے؛ بلکہ وہ ابھی تک باور ہی نہیں کر رہے تھے کہ امریکہ نے اتنی صلاحیت حاصل کر لی ہے کہ وہ ایٹم بم کو جاپان تک پہنچا سکے، وہ اب تک یہی سمجھ رہے تھے کہ کوئی نئی قسم کا بم استعمال ہوا ہے۔ اسی لیے جب جاپان نے سرکاری سطح پر اس حملے کا اعلان کیا اُس اعلان میں لفظ ایٹم شامل نہ تھا۔

نیوی کی ٹیموں نے جا کر تحقیق کی تو پتہ چلا کہ اس بم سے ہونے والی تباہی روایتی بموں کی تباہی سے مختلف تھی۔ تمام شہر کھنڈر بن چکا تھا؛ جن عمارات کا ڈھانچا سلامت بھی دکھائی دیتا تھا وہ اندر سے مکمل طور پر ٹوٹ پھوٹ چکی تھیں۔ قبرستانوں کا کوئی نام ونشان نہیں تھا تمام گرجا گھر مسمار ہو چکے تھے۔ ۹۰% ڈاکٹر اور طبی عملہ یا تو مر چکا تھا یا معذور ہو چکے تھے۔ دھماکے میں زخمی ہونے والوں کو ہیبا کوشا hibakusha کا نام دیا گیا جس کا معنی تھا 'دھماکے سے متاثر ہونے والے'۔ ان متاثرین میں مرد وزن اور دوست اتنے عام تھے کہ ان کی ایک بڑی تعداد جسم میں پانی کی کمی (dehydration) کی وجہ سے ہلاک ہو گئی۔ ان کے بال گر گئے تھے اور اُن کے زخموں سے خون رس رہا تھا۔

ایک عینی شاہد' آکی ہیروتا کاہاشی' Mr. Akihiro Takahashi نے بتایا کہ وہ ۱۴ سال کا تھا اور جائے دھماکہ سے ڈیڑھ کلومیٹر دور سکول کی ایک قطار میں اپنے ہم جماعتوں کے ساتھ کھڑا تھا کہ اچانک بے انتہا گرمی کی لہر آئی اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ میرا سارا بدن جل اُٹھا ہے۔ میں نے گھر کی طرف بھاگنا شروع کیا تو مجھے لگا کہ میرے پیر بُری طرح جل رہے ہیں؛ پاؤں کے تلووں سے جلا ہوا گوشت نظر آرہا تھا، پھر میں کہنیوں اور گھٹنوں کے بل چل کر گھر پہنچا.....مذکورہ لڑکا ڈیڑھ سال تک زیرِ علاج رہا اور آج بھی وہ زندہ ہے لیکن آج بھی اُس کے ہاتھوں کے ناخن سیاہ اُگتے ہیں۔ ☆1-b

کشمیر میں زلزلے کے دوران ہم نے دیکھا کہ دوست ممالک میں ترکی فرانس اور دیگر مغربی ممالک کے ڈاکٹر، طبی عملہ اور دوائیں چار دنوں کے بعد پہنچیں؛ ایٹمی دھماکے کی صورت میں کوئی ہماری مدد کو نہیں آئے گا کیونکہ جان سب کو پیاری ہوتی ہے۔

پاکستان اور ہندوستان کے باشعور عوام کو اپنی اپنی حکومتوں سے سوال کرنا چاہیے کہ انہوں نے اپنے عوام کا پیٹ کاٹ کر ایٹم بم تو بنالیا ہے لیکن ایٹمی حملے کی صورت میں اپنے عوام کے بچاؤ کا کیا انتظام کیا ہے؟ اس کا جواب نفی میں ہے بلکہ دونوں ملکوں کی حکومتوں نے اپنے عوام کو ممکنہ حفاظتی اقدامات کے بارے میں بھی کچھ نہیں بتایا۔

خدانخواستہ جنگ یا کسی حادثے کی صورت میں (چرنوبل کی مثال ہمارے سامنے ہے) ہلاکتوں اور نقصانات کو کس طرح کم کیا جاسکتا ہے؟ اس سلسلے میں ہماری حکومتیں مکمل طور پر خاموش ہیں لیکن کینیڈا کی حکومت نے اپنے عوام کو خطرات سے آگاہ کرنے کے لیے ایک پروگرام شروع کیا ہے جس کے چیدہ چیدہ نکات یہ ہیں:

۵ میگاٹن ہائیڈروجن بم کا دھماکہ

ایک بڑے شہر کی مکمل تباہی کے لیے کافی ہے۔ اتنی قوت کا بم گرنے کی صورت میں روشنی کا تیز جھماکہ ہوگا اور بے انتہا حرارت خارج ہوگی اور دھماکے کی لہر سے تین میل تک تمام عمارات تباہ و برباد ہو جائیں گی اور ۲۰ میگاٹن دھماکے کی صورت میں یہ اثرات ہر طرف ۲۴ میل یا ۴۰ کلومیٹر تک جائیں گے۔ پہلے تیز روشنی کا جھماکہ ہوگا اور اگر یہ بم آپ سے ۱۰ میل کے فاصلے پر گرتا ہے تو آپ کے بچنے کے لیے صرف ۳۵ سیکنڈ ہوں گے۔ اڑتے ہوئے شیشے، کنکر، پتھر ہر طرف پندرہ میل تک لوگوں کو زخمی/ ہلاک کرسکتے ہیں۔ ہر شے جل رہی ہوگی، آگ کم از کم ۲۴ گھنٹے تک لگی رہے گی؛ فائر بریگیڈ کہاں سے آئے گا؛ وہ تو بیچارے پہلے ہی ہلاک ہو چکے ہوں گے کیونکہ اس وقت جتنے بھی آگ بجھانے والے سٹیشن ہیں وہ تمام شہروں کے اندر ہیں۔

تابکاری Fall out کیا ہے؟

گرد و غبار کے بادلوں کے ساتھ تابکار مادہ ہوا میں بلند ہوگا اور باریک ریت کے ذرات کی مانند ہر طرف بکھر جائے گا اور جس طرف ہوا کا رُخ ہوگا یہ تابکارہ مادہ فال آؤٹ سینکڑوں میل دور جاسکتا ہے۔ (یاد رہے کہ ہیروشیما میں 'لٹل بوائے' نامی بم سے صرف ۲۲ کلوٹن کا دھماکہ ہوا تھا یعنی صرف ۲۲ ہزار ٹن کی قوت کا دھماکہ ہوا تھا اور اب کوئی بھی بم میگاٹن، یعنی لاکھوں ٹن سے کم کا نہیں ہے) ۵ میگاٹن کے دھماکے سے سات ہزار مربع میل کے علاقے میں تابکار مادہ (فال آؤٹ) گرے گا اگر یہ دھماکہ ایک ملک میں ہو تو دوسرا بھی یقیناً متاثر ہوگا۔ یعنی اگر خدانخواستہ لاہور پر ۵ میگاٹن کا بم گرتا ہے تو ہر طرف ۸۰ میل یا ۱۲۰ کلومیٹر تک یہ تابکار مادہ گرے گا جس سے پاکستان میں ضلع لاہور کے علاوہ گوجرانوالہ، گجرات، سیالکوٹ، نارووال، شکرگڑھ، شیخوپورہ، قصور، فیصل آباد اور اوکاڑہ متاثر ہوں گے دوسری طرف بھارت کے اضلاع امرتسر، گورداس پور، جموں توی، ترن تارن، فیروزپور، موگا، فرید کوٹ، مکسر اور کپورتھلہ کے اضلاع اس فال آؤٹ کے اثرات سے بچ نہیں پائیں گے۔

یاد رکھیے کہ جہاں بم گرے گا اُن بے چاروں کو تو سنبھلنے کا اور کسی حفاظتی تدبیر کو اختیار کرنے کا موقع تک نہیں ملے گا لیکن دھماکے کے مقام سے ۸۰۔۸۵ میل دور رہنے والے اس تابکار مادے سے کیسے بچ سکتے ہیں؟

یہ فال آؤٹ دھماکے کے آدھے گھنٹے بعد شروع ہوگا یعنی تابکار گرد و غبار دھماکے کے آدھے گھنٹے بعد آسمان سے زمین کی طرف گرنا شروع ہوگا۔ یہ فال آؤٹ نظر نہیں آئے گا اس کی کوئی بُو نہیں ہوگی۔ یہ تابکار مادہ اگر انسانی جلد پر گرے گا تو جلد جل جائے گی۔ پانی میں گرے گا تو پانی زہر آلود ہو جائے گا یہ فال آؤٹ سانس کے ذریعے پھیپھڑوں میں جا کر انسانی جسم کے افعال کو متاثر کرتے ہوئے ایک مخصوص حالت Radiation Sickness یا تابکاری کی بیماری پیدا کرے گا۔ جس کی علامات یہ ہوں گی:۔

سر کے بال گر جائیں گے، بھوک ختم ہو جائے گی، رنگت زرد پڑ جائے گی، عمومی کمزوری اور اسہال شروع ہو جائے گلہ خراب ہوگا اور مسوڑھوں سے خون آنا شروع ہو جائے گا۔ یہ تابکارہ مادہ گلے میں اہم غدود Thyroid Gland میں کینسر پیدا کردے گا جو بذاتِ خود ایک مہلک بیماری ہے۔ تابکاری اُن

بچوں میں بھی معذوری پیدا کرسکتی ہے کہ جو ابھی پیدا نہیں ہوئے۔

فال آؤٹ سے بچاؤ کیسے ممکن ہے؟

کھلی فضا میں اس تابکار فال آؤٹ سے بچاؤ ناممکن تاہم ۱۶ انچ اینٹوں کی دیوار (زیرزمین ترجیحی طور پر) ۳ فٹ پیک مٹی کی دیوار ۱۵ انچ سٹیل کی چادر یا ۳ انچ سیسے (Lead) کی موٹی چادر سے بنی حفاظتی پناہ گاہ میں اس فال آؤٹ سے بچا جاسکتا ہے۔ یہ پناہ گاہ گھر کے اندر تہہ خانے یا بیسمنٹ میں بنائی جاسکتی ہے۔

یاد رکھیے کہ یہ فال آؤٹ تقریباً ۱۴ دن تک جاری رہے گا۔ لہذا اُس پناہ گاہ میں کم از کم دو ہفتے کے لیے پانی، خوراک کا ذخیرہ از قسم خشک دودھ، کھجور، بسکٹ وغیرہ موجود ہونا چاہیے۔ ابتدائی طبی امداد کی ضروری اشیاء اور درد کم کرنے والی دوائیں اور دوسری ضروری دواؤں کا بھی ذخیرہ رکھیں۔ فضلے اور کوڑا کرکٹ کیلئے پلاسٹک کے تھیلے رکھیں۔

اس پناہ گاہ میں کوئی آگ پکڑنے والی شے مثلاً پیٹرول وغیرہ نہ رکھیں۔ یاد رکھیں کہ ایٹمی دھماکے کی صورت میں تمام ذرائع مواصلات جواب دے جائیں گے لہذا بیرونی دنیا سے رابطہ صرف بیٹری سے چلنے والے ریڈیو کے ذریعے ممکن ہوگا۔ لہذا ریڈیو اور سیل بھی اُسی پناہ گاہ میں موجود ہونا چاہیے۔ موٹے کپڑے کمبل وغیرہ لازمی رکھیں۔

اگر یہ تابکار مادہ (فال آؤٹ) آپ پر گر جائے تو کیا کریں؟

اگر آپ محسوس کریں کہ فال آؤٹ کے ذرے آپ کے لباس پر پڑ گئے ہیں تو بیرونی کپڑے کوٹ قمیض وغیرہ پناہ گاہ سے باہر اتار کر اندر جائیں۔ ان کپڑوں کو مت جھاڑیں۔ ننگی جلد کو پانی سے اچھی طرح دھوئیں لیکن جلد کو ملنے یا رگڑنے سے اجتناب کریں کیونکہ اس سے یہ تابکار مادہ اور گہرائی تک چلا جائے گا۔

اگر خدانخواستہ کسی ایک شخص کو تابکاری کی بیماری (Radiation Sickness) ہو جائے تو دوسرے لوگ اطمینان رکھیں کہ یہ بیماری ایک شخص سے دوسرے کو منتقل نہیں ہوتی لیکن پانی اور خوراک کو اچھی طرح ڈھک کر رکھیں۔ ان معلومات کو خود بھی اچھی طرح سمجھیں اور تمام گھر والوں کو بھی سمجھائیں۔

پوٹاشیم آئیوڈائڈ کی گولیاں

Tab KI 130 mg پوٹاشیم آئیوڈائڈ کی گولیوں کا ذخیرہ لازمی طور پر رکھیں کیونکہ آئیوڈین کی یہ گولیاں گلے کے غدود Thyroid Gland کو تابکار آئیوڈین Radio Iodine سے محفوظ رکھتی ہیں۔ بُری خبر یہ ہے کہ آئیوڈین کی گولیوں کا موجودہ ذخیرہ ۲۴ گھنٹے میں ختم ہو جائے گا جبکہ یہ گولی روز کھانی ہوگی۔ چرنوبل کے حادثے کے بعد امریکی حکومت نے آئیوڈین کی گولیوں کی تین لاکھ خوراکیں ہنگامی حالت میں ذخیرہ کر رکھی ہیں۔ آپ اپنی حکومتوں اور وزارت صحت کے حکام سے پوچھیں کہ آیا انہوں نے اپنے عوام کے لیے مذکورہ دوائی کا مناسب ذخیرہ کر رکھا ہے؟ کیا وہ عوام کو دستیاب ہے؟ ہنگامی صورت میں مذکورہ دوائی کی عدم دستیابی کی صورت میں آئیوڈین ملا نمک ہی بچاؤ کا واحد ذریعہ ہے جس میں ۷۶.۵% آئیوڈین موجود ہوتی ہے۔

حرفِ آخر

پاکستان اور ہندوستان کے سنجیدہ و فہمیدہ حلقوں سے دست بستہ التماس ہے کہ اپنے اپنے دائرہ اثر میں جنگی جنون کو بڑھنے سے روکیں جوہری دھماکے کی صورت میں تابکاری کے اثرات کا صحیح ادراک کریں کیونکہ زندگی قدرت کا انمول عطیہ ہے جو دوبارہ کسی صورت میں بھی نہیں ملتی۔

ہندوستان کے باسی تو شاید پھر تناسخ کے عقیدے کے تحت کسی دوسرے جنم کی توقع رکھتے ہوں لیکن مسلمانوں کو یہ زندگی پھر نہیں ملنے والی جب کہ اسلام کا تو مطلب ہی سلامتی ہے۔

فاعتبروا یااولی الابصار

حوالہ جات:

(خلائی سائنس اور پتھر کے زمانے کی سیاست، مصنف جون ایوری، ترجمہ محمد ارشد رازی، مشعل بکس، گارڈن ٹاؤن، لاہور، ایڈیشن ندارد، ۲۰۰۶ء، صفحہ ۱۱۷) ☆☆

1. http://motherearth.com echological scene efter nuclear war-by Prof. Paul Ehrlic & Assoicates Dept. of Biological Sciences USA.Stanford University.

☆ laa2 ۱۹۵۱ء میں یہ احوال لکھنے کے بعد یہ لڑکا تابکاری کی وجہ سے مر گیا اور اس کی ماں بھی چل بسی۔ (خلائی سائنس اور پتھر کے زمانے کی سیاست، مصنف جون ایوری، ترجمہ محمد ارشد رازی، مشعل بکس، گارڈن ٹاؤن، لاہور، ایڈیشن ندارد، ۲۰۰۶ء، صفحہ ۹۸، ۹۹)

2. http:// www.survival@webpal.org

3. www.KI4U.com/plan_Bhtm.

4. http://www.wikipedia.org/radiationprotection

کامیو، عقل یا جہنم۔ برٹش میڈیکل پروفیسر لاون۔ آنے والی نسلوں کے مقدر کا فیصلہ کرنے والے ہم کون

5-

آہ افتخار مجاز! بولتا لاہور خاموش ہو گیا

ناصر بشیر/لاہور

ابھی چند روز قبل، بولتا لاہور خاموش ہو گیا۔ مَیں افتخار مجاز کی بات کر رہا ہوں۔ افتخار مجاز لاہور کی علمی اور ادبی تقریبات کی جان تھے۔ شوخیٔ گفتار سے محفل کو لالہ زار بنانے کا فن اُنھیں آتا تھا۔ کتنی مزے کی بات ہے کہ وہ شاعر نہیں تھے، لیکن شاعروں کی محفل میں مرکزِ نگاہ بن جایا کرتے تھے۔ کسی کتاب کے منصف نہ تھے، لیکن لکھنے والوں کے حصار میں گھرے رہتے تھے۔ کتابوں کے رسیا تھے۔ اچھی کتابیں ڈھونڈتے، اُنھیں پڑھتے۔ اُن پر تبصرہ کرتے۔ تبصرہ نہ کرتے تو زبانی اس کا ذکر کرتے اور محفل محفل کرتے۔ ایک کتاب اگر اُن تک پہنچ جاتی تھی تو اس کا ذکر شہر بھر میں ہوتا تھا۔ اچھی کتابوں کا ذکر اچھے لفظوں میں کرتے اور بُری کتابوں پر تابڑ توڑ حملے کرتے، اچھے مصنف کا سر فخر سے بلند ہو جاتا اور بُرا مصنف منہ چھپائے پھرتا۔ کتاب کا ایسا ذہین اور فطین قاری کم کم ہی دکھائی دیتا ہے۔ وہ کتاب دوستی کا ایک عملی پیکر تھے۔ اگرچہ این بی ایف کی اُن پر نظر نہیں پڑی، لیکن سچ یہ ہے کہ وہ ایک فعال اور سرگرم سفیرِ کتاب تھے۔

مجھے وہ سرسید کے قریبی ساتھی اور معتمد نواب سید مہدی علی خان المعروف وقار الملک کی طرح لگتے تھے۔ انھوں نے بھی کوئی کتاب نہیں لکھی تھی، لیکن ان کے زمانے کے سارے بڑے ادیب اور شاعر اُن کا احترام کرتے تھے۔ افتخار مجاز کا بھی یہی عالم تھا۔ لاہور کیا پورے پاکستان کے ادیب اور شاعر ان کی دل سے عزت کرتے تھے۔ کتاب چھپتی تو افتخار مجاز تک اپنی کتاب پہنچانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ جیسی بے لاگ رائے وہ دیں گے، اور کوئی نہ دے گا۔ نواب سید مہدی علی خان کی طرح، افتخار مجاز کے کتاب خانے میں بھی ہزاروں کتابیں تھیں۔ انھیں کتابیں جمع کرنے کا فقط شوق نہ تھا۔ پڑھتے بھی تھے۔ ان کی مرتب و منظم شخصیت اور مربوط و موزوں گفتگو اس بات کی گواہی دیتی تھی کہ حاصلِ مطالعہ کیا ہے؟

اگر افتخار مجاز نے کوئی کتاب نہیں لکھی تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انھیں لکھنے لکھانے سے ہرگز شغف نہ تھا۔ وہ جیسی شگفتہ گفتگو کرتے تھے، ویسی شگفتہ نثر لکھا کرتے تھے۔ ان کے کالم مختلف اخبارات کے ادارتی صفحات پر چھپتے تھے۔ ان کی زبان سادہ، رواں اور شستہ ہوتی تھی۔ اُن کے کالموں کی خاص بات یہ تھی ان میں جگہ جگہ عمدہ اشعار اور مشہور واقعات کی پیوند کاری بھی ہوتی تھی۔ انھیں کسی پکے پیڑھے شاعر کی طرح لاتعداد شعر یاد تھے اور کمال کی بات یہ ہے کہ انھوں نے کبھی کوئی شعر غلط نہیں لکھا۔ ان کے شعروں کے انتخاب سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کے اندر ایک شاعر چھپا ہوا ہے، جسے باہر آنے کا موقع نہیں مل سکا۔ موزوں طبع تھے۔ وہ نہایت آسانی سے شعر کہہ سکتے تھے لیکن شاید اپنے بڑے بھائی اعزاز احمد آذر کے احترام میں ضبط کیے رہے۔ اپنے کالموں میں عام طور پر وہ آذر صاحب کے اشعار ہی شامل کرتے تھے۔ مَیں نے تو انھیں ایک بار مذاق مذاق میں کہہ بھی دیا تھا کہ کہیں آپ کے کالم آذر صاحب تو نہیں لکھتے؟..... افتخار مجاز نے ایک کالم میں یہ شعر درج کیا تھا:

لوگوں نے احتجاج کی خاطر اٹھائے ہاتھ
اُس نے کہا کہ فیصلہ منظور ہو گیا

یہ اتنا سادہ، رواں اور خوب صورت شعر ہے کہ آج بھی افتخار مجاز کی یادنشانی بن کر میرے حافظے میں چمٹا ہُوا ہے۔ شعر ہے، کس کا؟ آج تک معلوم نہیں ہو سکا۔

اللہ تعالیٰ نے افتخار مجاز کو یادداشت بھی بلا کی عطا کی تھی۔ پرانے واقعات انھیں ہر وقت یاد رہتے تھے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ ہم نے کسی مرحوم ادیب یا شاعر کا نام لیا تو مجاز صاحب نے اس سے متعلقہ کتنے ہی واقعات آناً فاناً سنا ڈالے۔ بیش تر واقعات کے وہ چشم دید گواہ تھے۔ چلیے مانا کہ جو واقعہ آپ کے سامنے رونما ہُوا، وہ تو آپ کو یاد رہی جاتا ہے، مجاز صاحب کو کتابوں میں پڑھے ہوئے واقعات بھی حرف بحرف یاد تھے۔ وہ پورا واقعہ بغیر کسی تصرف کے سنا کر سب کو حیران کر دیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی ان کا یہ حافظہ ہمارے لیے مصیبت بن جاتا تھا۔ کسی تقریب کی نظامت مجاز صاحب کو سونپ دی جاتی تو حاضرینِ کرام پہلو بدل بدل کر انھیں احساس دلاتے کہ وقت تیزی سے گزر رہا ہے، چونکہ ذہین آدمی تھے اس لیے وہ وقت کی نزاکت بھانپ جاتے اور اپنی بات مختصر کرنے کی کوشش کرتے۔

شخصیت نگاری، یادنگاری اور تبصرہ نگاری کو انھوں

نے اپنے کالموں کا موضوع بنایا۔ پاکستانیت ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، سچے مسلمان اور اچھے انسان تھے۔ مَیں نے نہیں دیکھا کہ انھوں نے کبھی اپنے سے چھوٹے یا بڑے کی کبھی دِل آزاری یا تضحیک کی ہو۔ ان کی گفتگو اور تحریر کا پہلا قرینہ ادب، احترام اور شائستگی تھا۔ البتہ طنزیہ فقرے کا جواب، اُسی لہجے میں برجستہ دیا کرتے تھے۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے ایک ذہنِ رسا عطا کیا تھا، جو ہر وقت جاگتا رہتا تھا۔ ان کی زبان ان کے ذہن اور دِل و دماغ کی رفیق تھی، جو ان کے ذہن اور دِل و دماغ میں ہوتا، زبان پر لے آتے تھے۔ چونکہ لوگ جانتے تھے کہ مجاز صاحب، دِل کے سچے اور نیت کے کھرے ہیں اِس لیے کبھی ان سے ناراض نہیں ہوتے تھے۔

وہ جب بھی روزنامہ ''پاکستان'' میں میری تازہ غزل یا نظم پڑھتے تو اس کی داد میرے مدیرِ گرامی مجیب الرحمٰن شامی کو دیتے۔ کہتے یہ تمھارا کمال نہیں کہ تم عصرِ رواں کی روح کے مطابق ہر روز تازہ غزل یا نظم کہتے ہو، یہ سب شامی صاحب کا کمال ہے جنھوں نے تمھارے اندر موجود اصل شاعر دریافت کیا اور اسے اظہار کا موقع دیا۔ میرا خیال ہے کہ ان کی یہ بات صد فی صد درست تھی۔ کبھی کبھی ہنستے ہوئے ٹھیٹھ پنجابی میں کہتے: ''یار! ناصر بشیر! تیری غزل اتنی اچھی ہوتی ہے کہ تیری لگتی ہی نہیں''۔ یہ بات انھوں نے ایک بار نہیں، دوستوں کی موجودگی میں کئی بار کہی۔ یوں بھی پاکستان ٹیلی ویژن میں ان کا شعبہ کرنٹ افیئرز تھا اس لیے میری شاعری کو پرکھنے کے لیے انھوں نے ایک پیمانہ بنا رکھا تھا۔ میری غزل کے اوپر ہمیشہ ''آج کی غزل'' کا عنوان دیا جاتا ہے۔ مجاز صاحب نے ہمیشہ کہا کہ یار تیری غزل واقعی آج کی غزل ہے۔ یہ پاکستانی پاکستانی قومی شاعری کا ایک نیا باب مرتب ہو رہا ہے۔

یہاں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ افتخار مجاز سے میرا تعلق پی ٹی وی کے پروڈیوسر اور ٹیلنٹ کا نہیں تھا۔ میرا ان سے ہمیشہ مضبوط ذاتی تعلق رہا، لیکن مَیں نے ان کے کسی ٹی وی پروگرام میں شرکت نہیں کی۔ ایک بار انھوں نے مولانا ظفر علی خان سے متعلق ایک پروگام میں مدعو کیا تھا، لیکن اس میں شریک نہ ہو سکا۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اُن سے میرا بے لوث اور بے غرض تعلق تھا۔ جس میں محبت بھی شامل تھی اور احترام بھی۔

آخر میں اپنے ناشر دوستوں کے سامنے ایک تجویز رکھنا چاہتا ہوں کہ افتخار مجاز کے لکھے ہوئے تمام کالموں کو یکجا کر کے کتابی صورت میں چھاپ دیا جائے تو نثر کا ایک شگفتہ، سادہ اور منفرد اسلوب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائے گا۔ ان کے کالموں میں لاہور کی علمی، ادبی اور صحافتی زندگی کی چلتی پھرتی تصویریں ہیں۔ زندہ واقعات ہیں۔ اس سب کو محفوظ کر کے لکھنے والوں کی نئی نسل کے لیے زادِ راہ فراہم کیا جا سکتا ہے۔

مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ جس طرح سرسید کے دور میں نواب سید مہدی علی خان المعروف وقار الملک جیسا کوئی دوسرا نہ تھا اسی طرح آج ہمارے دور میں بھی کوئی دوسرا افتخار مجاز نہیں۔

غزلیں

کہنے کو بادہ خانے میں بھی اذنِ عام ہے
ساقی نہ محتسب ہے نہ مے ہے نہ جام ہے

ہوتا نہیں ہے تو مری خلوت سے بھی جُدا
مانوس تیرے غم سے مری صبح و شام ہے

اک لازوال حُسن ملا میری فکر سے
رعنائیوں کو مجھ سے ہی حاصل دوام ہے

تکمیل جس کی شام و سحر سے نہ ہو سکی
خود زندگی بھی آرزوئے ناتمام ہے

مسعودؔ رازِ شوق نہ آنکھوں سے ہو عیاں
دل بھی کہاں بتائے ترا کیا مقام ہے

.....

کسی کو راس نہ آیا سکوں کا پیراہن
سبھی نے پہنا ہے حالِ زبوں کا پیراہن

خرد کی بات زُباں پر کبھی نہیں آئی
ہمیں ازل سے ملا ہے جنوں کا پیراہن

کسی کا سحرِ نظر جب تلک نہ ہو حاصل
میں کیسے پہنوں جہاں میں فسوں کا پیراہن

اوڑھایا سوزِ محبت نے وحشتوں کا لباس
بنایا دیدہ تر نے وہ خوں کا پیراہن

عجیب پتھروں کی بارش کا تھا سماں مسعودؔ
کہ میں نے خواب میں پہنا جنوں کا پیراہن

خالد مسعود

ناصر کاظمی اور پہلی بارش

لبنیٰ صفدر/لاہور

شاعری جذبے اور تخیل کا نام ہے۔ جذبات اور تخیل کے لیے ماحول کی چار دیواری کا ہونا ضروری ہے۔ پچھلے دو سو برس کی تاریخ دیکھی جائے تو ہمارے اجتماعی رویے، روایات اور اختیارات میں اس قدر تیزی کے ساتھ تبدیلی آئی ہے کہ ماحول معاشرتی اعتبار سے بہت حد تک ناپائیدار، بے اصل اور غیر یقینی ہوتا ہوا نظر آ رہا ہے اور بار ہا ہمارے جذبات اور تخیل کے روایتی اور تاریخی رشتے ٹوٹ ٹوٹ کر بنتے بگڑتے رہے ہیں۔ اس لیے جذبات اور تخیل پر داخلی رجحانات کا غلبہ ایک لازمی امر تھا۔ ہمارے جذبات کا اظہار بھی داخلی تھا اور ہمارے تخیل کی پرواز بھی داخلی تھی۔

''پہلی بارش'' ناصر کاظمی کی حمدیہ غزلوں کا مجموعہ ہے جس میں جذبات، تخیل اور داخلی رجحانات کا غلبہ نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ اس مجموعہ میں لفظیات کا صاف ستھرا استعمال اور اسلوب کا انوکھا رنگ ڈھنگ قاری کو پوری طرح سے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شاعر کے قوتِ تخیل اور قوتِ مشاہدہ کی پرواز بہت بلند ہے۔ جس کی بنیاد پر وہ عشق حقیقی کو نئے رنگ اور ڈھنگ کے ساتھ دیکھتا ہے۔ فارسی، عربی اور اردو شاعری کی تاریخ حمدیہ کلام سے بھری ہوئی ہے۔ لیکن ہمیں اکثر جگہوں پر ایک سی عقیدت کے رنگ، ایک سے الفاظ اور خیالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جبکہ ''پہلی بارش'' کی حمدیہ غزلیں اپنی طرز کی انوکھا تجربہ ہیں۔ غالب احمد ''پہلی بارش'' کے دیباچہ میں رقمطراز ہیں:

''ناصر کاظمی من و تو کے اسی وصال کا شاعر ہے۔ اردو شاعری حسن و عشق، من و تو اور وجود و وجدان کے بعد جس بعد کا شکار رہی ناصر نے جدید دور کے تقاضوں کے مطابق بعد کی اس خلیج کو پاٹ دیا ہے۔ ''پہلی بارش'' میں نظم اور غزل کا امتیاز اُٹھ گیا ہے۔ جدت اور تجدید ہم آغوش نظر آتے ہیں اور روایت اور وجدان کے امتزاج نے زبان کے شعور کے مختلف علاقوں کو ایک کر دیا ہے۔''

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ناصر کاظمی کا مشاہدہ نہایت عمیق ہے۔ وہ داخلی اور خارجی مظاہر کی تہہ میں اُتر جاتے ہیں۔ ان کے اشعار پہلے پہل تو پہیلیاں لگتے ہیں لیکن جب بار بار پڑھو تو یہی پہیلیاں ہمیں اپنے اردگرد کی بکھری ہوئی کہانیاں معلوم ہونے لگتی ہیں۔ ناصر کاظمی کو حمد کے اس انوکھے طرزِ بیان کا پوری طرح سے ادراک تھا۔ انہوں نے ''پہلی بارش'' کے بارے میں خود کہا تھا کہ اس کا شمار چند بہترین حمدیہ اشعار میں ہوگا اور اس حقیقت سے آج تک کسی کو انکار نہیں ہے۔

''پہلی بارش'' کی پہلی غزل اس کتاب کی کہانی کے مرکزی کردار کا تعارف بھی ہے۔ جو سراسر اللہ اور اس کتاب کو ماننے والا ہے۔ جو سرتاپا عشق حقیقی میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ اپنے مقام اور رب کائنات کے مقام سے بخوبی واقف ہے۔ تبھی تو لکھتا ہے:

میں نے جب لکھنا سیکھا تھا
پہلے تیرا نام لکھا تھا
میں وہ صبر صمیم ہوں جس نے
بارِ امانت سر پہ لیا تھا

پہلی بارش بھیجنے والے
میں ترے درشن کا پیاسا تھا

باصر سلطان کاظمی ''پہلی بارش'' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''پہلی بارش کے آغاز میں کیفیت تو من شدی، من تو شدم' کے مصداق نظر آتی ہے۔ دو روحوں کا پیاسا بادل گرج گرج کر برستا ہے۔ دو دریاؤں کو چڑھتا دریا ایک ہی ساگر میں گرتا ہے اور دل کی کہانی کہتے کہتے رات کا آنچل بھیگ جاتا ہے۔''

شاعری ناصر کاظمی کا اوڑھنا بچھونا رہی۔ شاعری سے عشق زندگی سے عشق کے مصداق تھا۔ ناصر کاظمی کے ہاں شاعری کے معنی بہت وسیع تھے۔ اپنے آخری انٹرویو میں کہتے ہیں:

''مجھے غزل، قطعہ، رباعی، آزاد نظم وغیرہ سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ تمہیں پتہ ہے شاعری صرف مصرعے لکھنے کا نام نہیں ہے۔ شاعری تو ایک نقطہ نظر ہے زندگی کو دیکھنے کا، چیزوں کو دیکھنے کا، ان کو موزوں طریقے سے بیان کرنے کا نام شاعری ہے۔''

لفظ اور معنی کا گہرا رشتہ پہلی بارش میں نظر آتا ہے۔ بظاہر نہایت سادہ اور آسان الفاظ ہیں لیکن جب معنی پر غور کرنے بیٹھیں تو پرت در پرت ایک نیا جہان نظر آنا شروع ہو جاتا ہے۔ ناصر کاظمی روایت سے جڑے ہوئے شاعر ضرور ہیں لیکن ان کا شعری شعور جدید آہنگ رکھتا ہے۔ مصرعوں میں صوتی آہنگ ہے جنہیں بآسانی گنگنایا بھی جا سکتا ہے۔ پہلی بارش کا فنی و اسلوبیاتی جائزہ لیں تو مزید کئی خصوصیات کھلتی ہیں۔

تشبیہات کا استعمال:

شاعر شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے کلام کو خوبصورت بنانے کے لیے تشبیہات کا استعمال کرتا ہے۔ ناصر کاظمی نے بھی تشبیہات کے ذریعے کلام میں حسن بھر دیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائی:

دو روحوں کا پیاسا بادل
گرج گرج کر برس رہا تھا
شام کا شیشہ کانپ رہا تھا
پیڑوں پر سونا بکھرا تھا
تیری ہلال سی اُنگلی پکڑے
میں کوسوں پیدل چلتا تھا

استعارے:

عابد علی عابد "البیان" میں لکھتے ہیں:

"شاعر پرانے تلازمات کے بندھن توڑ دیتا ہے اور نئے تعلقات دکھا کر ہمارے تجربے کو تازگی، صورت پذیری اور تیز بینی عطا کرتا ہے اور اصل استعارے کا تعلق اشیاء کو پرانی جیسی خوبصورتی ہی عطا نہیں کرتا بلکہ انہیں ہماری اُمیدوں، رشتوں اور روایتوں کو مضبوط کر کے زندگی عطا کرتا ہے۔"

ناصر کاظمی نے بھی خوبصورت الفاظ بطور استعارہ استعمال کیے ہیں۔ سورج، پانی، موسم، درخت، رات، بادل، چاند، بارش، کبوتر، تارے، پتھر، آئینہ وغیرہ کو ناصر کاظمی کی شعری فضا میں ایک خاص استعاراتی حیثیت حاصل ہے۔

تیرے گھر کے دروازے پر
سورج ننگے پاؤں کھڑا تھا
ٹھنڈی دھوپ کی چھتری تانے
پیڑ کے نیچے پیڑ کھڑا تھا

لفظیات:

ناصر کاظمی نے الفاظ کا انتخاب اور چناؤ بھی عمدگی سے کیا ہے۔ ہر لفظ مکمل اور ایک دوسرے کے ساتھ پیوست نظر آتا ہے۔ الفاظ کی خوبصورتی اور بندش خوبصورت شعر کا لازمہ ہے۔ اگر مضمون اچھا ہو اور الفاظ اس کی مناسبت سے نہ ہوں تو شعر کا سارا حسن تباہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ شعر کی ہر سطر تخلیق کار کی جان کاہی، توجہ اور محنت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ فلسفیانہ انداز و بیان کے باوجود الفاظ کی سادگی اور تخیل کی گہرائی عجیب سا مجموعہ ہے جو قاری پر سحر سا طاری کر دیتا ہے۔ صوتی اعتبار سے بھی تمام مجموعہ میں ایک مخصوص آہنگ ہے۔

انیس ناگی کہتے ہیں:

"تخلیق شعر میں لفظ کے استعمال کی بنیادی غایت تخلیقی تجربے کی ترسیل اور تشکیل ہے۔ لفظ شاعر کا بنیادی حربہ ہے۔ اسی کے ذریعے وہ تجربے کے خدوخال متعین کرتا ہے اور یہی لفظ قاری کے لیے افہام کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ تخلیق شعر میں لفظ شعر کی واردات کا ترجمان ہوتا ہے۔ بلکہ یوں کہا جا سکتا ہے کہ لفظ بذاتِ خود شاعر کی واردات ہوتا ہے۔"

ناصر کاظمی کے ہاں صوتی آہنگ اور منظر نگاری دیکھیے:

تیرے بالوں کی خوشبو سے
سارا آنگن مہک رہا تھا
چاندی کا ایک پھول گلے میں
ہاتھ میں بادل کا ٹکڑا تھا

ناصر کاظمی کی ہر غزل میں ایک تسلسل موجود ہے۔ پہلے شعر سے آخری شعر تک ایک پوری کہانی ہمیں نظر آتی ہے۔ اشعار اپنا جداگانہ وجود رکھتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے ساتھ منسلک نظر آتے ہیں۔ پہلی بارش کی غزلیں بھی انفرادی طور پر مکمل غزلیں ہونے کے ساتھ ساتھ مل کر ایک وحدت کی تشکیل کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ جیسے کسی زینے کے مدارج یا کسی منزل کے مراحل۔

پہلی غزل میں کہانی کے مرکزی کردار کا تعارف ہے جو اللہ سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔ اس سے اپنی عقیدت و محبت کا اظہار کرتا ہے لیکن ساتھ ہی شکوہ کرنے کی جرات بھی رکھتا ہے۔ اسی طرح بارہویں غزل میں ایک ڈراؤنے خواب کا بیان ہے۔ تجھ سے بچھڑ کر میری حالت غیر ہے اور طرح طرح کے وسوسے اور خیال مجھے ستاتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ میری نیند بھی وسوسوں اور وہم سے خالی نہیں ہوتی۔ اسی طرح تیرہویں کہانی میں مرکزی کردار آتش دان میں لکڑی کی طرح جلتا دکھائی دیتا ہے۔

تنہائی کے آتش دان میں
میں لکڑی کی طرح جلتا تھا

ناصر کاظمی کی پہلی بارش کی غزلوں میں موت اور بعد از موت کا سفر دکھائی دیتا ہے اور ساتھ ہی اس کی منزل بھی۔

ناصر کاظمی کی شاعری میں تنہائی میں خدا کا احساس بھی ملتا ہے اور خوفِ خدا بھی۔ تقدیر کا بھی قائل ہے اور اپنے نصیب کا بھی۔ اسی لیے وہ خدا سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ وہ ایسا صبر صمیم ہے جس نے اپنی مرضی سے اپنا اختیار استعمال کرتے ہوئے بارِ امانت سر پہ لیا تھا اور جب وہ یہ کہتا ہے کہ

جو پایا ہے وہ تیرا ہے
جو کھویا ہے وہ بھی تیرا تھا

تو اس سے لاچاری کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ وہ صرف یہ کہنا چاہتا ہے کہ سب کچھ اللہ کی ملکیت ہے۔ ناصر کاظمی تنہائی اور خاموشی میں اللہ سے مخاطب ہوتا ہے۔ مارٹن لوتھر نے بھی اس امر کا اعتراف کیا ہے۔

محبت کی پرورش کے لیے بھی تنہائی اور خاموشی کی ضرورت ہے۔ ناصر کاظمی کو جدید اُردو ادب کے منظرنامے میں ایک اہم اور نمایاں مقام حاصل ہے۔ ان کے کلام میں فنی و فکری خصوصیات موجود ہیں۔ وہ ایک عہد ساز شاعر ہیں۔ اپنے عہد کا توانا لہجہ ہیں۔ اگر ناصر کاظمی نے یہ کہا تھا کہ پہلی بارش کا شمار چند بہترین حمدیہ اشعار میں ہوگا تو گزرتے وقت نے ان کی اس بات کی تصدیق کردی ہے۔

حوالہ جات:

(۱) غالب احمد، دیباچہ، پہلی بارش، لاہور، جہانگیر بک ڈپو، ۲۰۰۲ء، ص ۱۰

(۲) باصر سلطان کاظمی، دیباچہ، پہلی بارش، لاہور، جہانگیر بک ڈپو، ۲۰۰۲ء، ص ۲۱

(۳) عابد علی عابد، سیّد، البیان، لاہور، مجلس ترقی ادب، طبع اول، فروری ۱۹۸۹ء، ص ۲۶۱

(۴) انیس ناگی، ڈاکٹر، تنقید شعر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۴۹

(۵) حفیظ صدیقی، ابوالاعجاز، تفہیم و تحسین شعر، لاہور، سنگ پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۴۷

محبت چھوگئی دل کو

پرندوں کے حسین نغموں کی لو چن
بڑھتی جاتی ہے
مہک ایسی کہاں ہوتی تھی پھولوں میں کبھی پہلے
زمیں کے رنگ اُجلے لگ رہے ہیں
اس لیے شاید
کہ ساون رُت میں سارے داغ دھبے
دُھل ہی جاتے ہیں
مگر یوں زندگی سے پیار پہلے تو کبھی کب تھا
طبیعت میں عجب مستی ہے
دنیا اچھی لگتی ہے
ہمارے ہر طرف یہ اجنبی خوشبو جو پھیلی ہے
تو لگتا ہے
محبت چھوگئی دل کو
محبت ہوگئی جاناں.....!

(عامر بن علی)

سکول، کالج، یونیورسٹی کے طلبہ اور ریسرچ سکالرز کے لیے ہماری چند کتب

مضامین پطرس	پطرس	-/140 روپے
مضامین فرحت اللہ بیگ	مرتبہ: ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	-/350 روپے
جاڑے کی چاندنی	غلام عباس	-/200 روپے
مراۃ العروس مع فرہنگ	ڈپٹی نذیر احمد	-/200 روپے
اُردو تحقیق صورت حال اور تقاضے	ڈاکٹر معین الدین عقیل	-/700 روپے
اُردو ادب کا ارتقاء	ڈاکٹر وحید قریشی	-/150 روپے
اُردو تنقید (انتخاب مضامین)	پروفیسر اشتیاق احمد	-/700 روپے
اُردو غزل (غزل کی دوسو سالہ تاریخ)	ڈاکٹر یوسف حسین خان	-/800 روپے
مقدمہ شعر و شاعری	الطاف حسین حالی	-/200 روپے
مقالات اقبال	عبدالواحد معینی	-/400 روپے
تنقیدات حسین فراقی	پروفیسر اشتیاق احمد	700 روپے
تنقید اور مجلسی تنقید	ڈاکٹر وزیر آغا	-/300 روپے
تحقیق شناسی	ڈاکٹر رفاقت علی شاہد	-/500 روپے
اصلاح تلفظ و املاء	طالب ہاشمی	-/250 روپے
اُردو کے 25 افسانے	ڈاکٹر اورنگ زیب عالمگیر	-/500 روپے
نیا افسانہ اور قاری	ڈاکٹر طاہر تونسوی	-/250 روپے
ولی تحقیق و تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر محمد اشرف خان	-/250 روپے
فیض احمد فیض (تنقیدی مطالعہ)	ڈاکٹر طاہر تونسوی	-/400 روپے
داستان اقبال	آمنہ صدیقہ	-/200 روپے

ناشر: القمر انٹر پرائزز، غزنی سٹریٹ اُردو بازار، لاہور 042-37237500

''تحفہ'' جہاں گردی

راجانیّر/لاہور

قارئین! عامر بن علی ایک ہمہ جہت انسان ہیں وہ معروف شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ سفر نامہ نگار، مترجم اور کالم نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ خیر سے ان کی آٹھ کتابیں شائع ہو کر علمی و ادبی حلقوں میں شہرت پا چکی ہیں۔ ان کا ایک شعر.....

حُسن اور حکومت سے کون جیت سکتا ہے
یہ بتاؤ دونوں کی عمر کتنی ہوتی ہے

زبان زدِ عام کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔ گزشتہ دنوں راستی انٹرنیشنل کے زیر اہتمام ان کے تازہ سفر نامے ''جہاں گردی'' کی تقریب رونمائی اکادمی ادبیات لاہور مرکز میں منائی گئی اس موقع پر پڑھی گئی ایک شگفتہ تحریر آپ سب کی نذر ہے۔

صاحبو! میں اچھا خاصا ہمارے قومی منشور پر عمل پیرا فراغت سے مشغول تھا کہ معروف شاعرہ نیلما درانی کا فون آیا انہوں نے حکم دیا کہ میں عامر بن علی کے لئے ایک تقریب منعقد کر رہی ہوں جس میں نہ صرف یہ کہ آپ نے آنا ہے بلکہ مسلح ہو کر یعنی گویا مضمون بھی لکھ کر لانا ہے۔ اب میں ٹھہرا سیدھا سادہ .....شاعر اور انہوں نے مضمون لکھنے جیسے مشکل کام کی ڈیوٹی سونپ دی..... خیر آمدن بر سرِ مطلب صاحبو! میں نے ایک ترقی پسند شاعر اور دانشور لطیف ادیب کے گھر ہوش سنبھالا تو ایام جوانی کو چھونے تک آمریت اور آمروں سے شدید نفرت میرے رگ و پے میں دوڑ رہی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ 80ء کی دہائی میں اس وقت کے آمر کے خلاف شاعری کرتے وقت ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ 90ء کے وسط میں کسی عامر کی محبت میں ایسے گرفتار ہوں گے کہ نہ صرف اس کی تعریف کرنی پڑے گی بلکہ وہ اتنا اچھا ہوگا کہ اس کے لیے بات کرتے وقت الفاظ بھی کم پڑ جائیں گے.....

یقین کیجئے عامر بن علی میں جس قدر محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اگر کبھی شاعروں میں اس کا 10 فیصد بھی پایا جاتا تو دنیا جنت بنتی یا نہ بنتی کم از کم سینئر جونیئر کے جھگڑے میں وقت ضائع کرنے والے اکثر شاعر، اچھے شاعر بن جانے کے حادثے سے دو چار ہو چکے ہوتے۔

عامر بن علی فطری طور پر محبت سے لبریز انسان ہے اور اسی محبت کے باعث اس نے اوائل عمری ہی میں شہرت بخاری، احمد ندیم قاسمی، عطاء الحق قاسمی، اسلم کولسری اور منو بھائی جیسی برگزیدہ ادبی شخصیات کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ انہی کی دیکھا دیکھی مجھ ایسے کئی..... خصوصاً صفر اصدف، رُخسانہ نور، حسن عباسی حتیٰ کہ ناصر بشیر (یعنی شہرت سے لے کے آج کے ناصر بشیر تک) عامر بن علی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔

یادش بخیر ابرار ندیم تو اس کے لیے قدرت کی طرف سے مسلط کیا گیا ایسا ''تحفہ'' ہے جس پر عامر بن علی مدت معید سے ''صبر گزار'' ہے..... کیوں کہ اس کی ہر بات پر اسے واہ ابرار واہ ابرار ضرور کہنا پڑتا ہے، جس پر میں اکثر سوچتا ہوں کہ اگر ابرار کا نام حیات ہوتا تو عامر کو داد دینا کتنا مہنگا پڑتا..... خیر..... ہر کس و ناکس کو یہ ''تحفہ'' عطا ہوتا نہیں

عامر بن علی لباس، اخلاق، خوشبو اور محبت کے معاملے میں ہمیشہ Selective رہا ہے۔ وہ جلدی تعلق نہیں بناتا لیکن بنا لے تو اس بندے کے ختم ہونے تک اپنی جانب سے تعلق نبھانے میں کوشاں رہتا ہے۔ مثال کے لیے جہاں گردی کا مطالعہ ضروری ہے۔ عامر بن علی نسلاً راجپوت ہے اور فطرتاً خوبرو ہے اُس میں برداشت کا مادہ ''مخفیہ'' کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ جب بھی کوئی شخص عامر بن علی سے پہلی بار ملتا ہے تو اس کا مسکراتا ہوا چہرہ روشنی بھری آنکھیں، محبت سے مرصع پیشانی اور متبسم لب ولہجہ لمحہ بھر کو تو اُسے مار ہی ڈالتا ہے۔ مجھے تشویش ہے کہ خواتین پر تو..... میں تھاں مر جانی آں..... والی کیفیت لمحوں کیا مہینوں طاری رہتی ہوگی۔ اُس کا ہفت زُباں ہونا بھی ایسے وقت میں اُس کی معاونت کے لیے ڈٹ جاتا ہوگا۔

اُردو زبان وادب کو عامر بن علی پر فخر کرنا چاہیے کہ اُس نے دو عالمی شہرت کے حامل شاعر گبریلا مسترال اور پابلو نرودا کی شاعری کا ہسپانوی زبان سے براہ راست اردو میں شعری ترجمہ کر کے ہماری زبان کو بین الاقوامی سطح پر سربلند کیا فی الاصل اس کا احسان ہے اگر وہ غلطی سے ''تحفے'' کی شاعری کا ہسپانوی ترجمہ شائع کر دیتا تو لاطینی امریکہ کا کیا ری ایکشن ہوتا.....

قارئین! میں بذات خود آج تک یہ تحقیق تو نہیں کر سکا کہ متذکرہ ادیبوں، شاعروں اور عام لوگوں میں اُس کے حقیقی دوست کون کون نہیں..... البتہ یہ ضرور جانتا ہوں کہ وہ سبھی کا دوست ہے..... عامر بن علی نے اپنی کتاب ''جہاں گردی'' میں جتنے غیر ملکی کرداروں کو بیان کیا اُن میں سے اکثر اُس کی محبت کے مارے ہوئے یا وہ خود اُن کی محبتوں کا اسیر دکھائی دیتا ہے۔

عامر بن علی کے ادبی سفر پر نظر ڈالیں تو آپ پر یہی کھلے گا کہ جب سے اُسے ''محبت چھو گئی ہے'' وہ ''سرگوشیاں'' کرتا رہتا ہے کہ یاد نہ آئے کوئی'' مگر پھر سوچتا ہے کہ'' چلو اقرار کرتے ہیں'' کہ محبت کے دو رنگ مسلمہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی گفتگو میں محبت کا موسم چھایا رہتا ہے..... اُسے جاپان اور جاپانیوں سے اتنی محبت ہے کہ اس کی نثری تحریروں، مضامین اور کالموں میں جاپانی معاشرت کا تذکرہ جابجا ملتا

ہے..... عامر بن علی اکثر اپنے آبائی شہر میاں چنوں میں بین الاقوامی اردو مشاعرے منعقد کرواتا رہتا ہے۔ اس پر میں سوچتا ہوں کہ کاش میاں چنوں جاپان میں ہوتا تو کئی شاعر جاپان یاترہ سے مستفید ہو جاتے۔ خیر عامر بن علی بات سے بات نکالنے اور تعلق کو تعلقات میں ڈھالنے میں بہت ماہر ہے..... لیکن حقیقی زندگی میں وہ بہت گہرا ہے۔ وہ دل کی باتیں زبان پر لاتے ہوئے بھی احتیاطی تدابیر کو اپنانے میں کوشاں رہتا ہے۔ البتہ اس کی آنکھیں اکثر و بیشتر اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ وہ شرارتی مزاج انسان ہے۔ دلیل کے طور پر یاد آیا ادبی دوستوں کی اکثریت نے عطاء الحق قاسمی کی زبانی یہ ذکر تو سُن رکھا ہوگا کہ حُسن کی تعریف کے حوالے سے احمد ندیم قاسمی جب بھی کسی حسین چہرے کو دیکھتے تو ماشاء اللہ کہتے جبکہ میں ہمیشہ انشاء اللہ کہتا ہوں۔ عامر بن علی اس معاملے میں چند قدم آگے ہے کہ وہ دونوں لفظ ادا کرتا ہے۔ لیکن..... دل ہی دل میں..... بات سے بات نکالنا عامر بن علی کی تحریروں کا خاصہ ہے..... اس حوالے سے میں اس کا ایک کالم ''مے کدے کا سبق'' آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

مے خانے کی حیثیت لاطینی امریکہ کے سماج میں کم و بیش وہی ہے جو ہمارے ہاں چائے کے کھوکھے کی ہوتی ہے۔ سمندر کے کنارے واقع ایک ایسے ہی مے خانے کے باہر بیٹھا، میں سرِ شام اُبھرنے والے چاند کا نظارہ کر رہا تھا۔ ایک طرف بحر الکاہل کی لہروں کا شور، جسے موسیقی کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ دوسری طرف ٹیالے پہاڑ ایستادہ، پرشکوہ اور ہیبت انگیز مل جل کر ایسی رومانوی فضا بنا رہے تھے جسے الفاظ میں بیان کرنا مشکل کیا، ممکن ہی نہیں۔ بیرے نے آکر میری ٹیبل پر رکھی شمع روشن کی اور آرڈر لکھنے کے لئے مؤدب انداز میں میز کے کنارے کھڑا ہو گیا۔ میں نے اسے الکوحل کے بغیر ''پریمابیرا کاک ٹیل'' لانے کے لئے کہا۔ ''پریمابیرا'' ہسپانوی زبان میں موسم بہار کو کہتے ہیں اور یہ ایک مقبول مشروب کا نام بھی ہے۔ میرے ساتھ والی ٹیبل پر ایک بوڑھا شرابی اپنے ہم عمر دوستوں کے ساتھ بنتِ انگور سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ میرا آڈر سن کر بڈھا تو گویا تڑپ اٹھا، اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا: الکوحل کے بغیر ''پریمابیرا'' کاک ٹیل ایسے ہی ہے جیسے رس کے بغیر گنا، یہاں تک آ گئے ہو تو پھر آدابِ مے کشی ہی سیکھتے جاؤ۔ کھلے آسمان کے نیچے ہوا کے تھپیڑوں سے ٹمٹماتی ہوئی شمعیں اور لوک گلوکار کی گٹار کے ساتھ لائیو پرفارمنس سمندر کے اس ساحل پر جسے ''عفیفی حسینہ'' کے نام سے جانا جاتا ہے، ایسا دلآویز ماحول بنا رہی تھیں کہ بڈھے شرابی کی بات ذرا بھی بری نہیں لگی۔ جس پیار بھرے شرارتی لہجے میں اس نے یہ بات کہی تھی وہ کسی بھی صاحب دل کو بری لگ ہی نہیں سکتی تھی۔ ویسے بھی میری نظر میں باتوں سے زیادہ لہجہ اہم ہوتا ہے۔

بحر الکاہل کے ساحل پر ملا بڈھا مجھے آج یوں یاد آیا کہ بہت سے اہلِ قلم مریم نواز کے سیاست میں سرگرم ہونے اور بیروزگار نوجوانوں کے لئے قرضے کی سکیم کا سربراہ بنائے جانے پر تنقید کر رہے ہیں۔ دوسری جانب بلاول بھٹو زرداری کے سیاسی کردار کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ ذاتی طور پر موروثی سیاست کا مخالف ہونے کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ شریف فیملی کے بغیر مسلم لیگ اور بھٹو خاندان کے بغیر پیپلز پارٹی ایسے ہی ہے جیسے رس کے بغیر گنا اور مٹھاس کے بغیر شہد۔ اور بقول بڈھے شرابی کے الکوحل کے بغیر ''پریمابیرا'' ہوتی ہے۔

اصول کی بات کی جائے تو اگر ٹیچر کی اولاد کا ٹیچر بننا معیوب نہیں، دوکاندار کا بیٹا دوکاندار بن سکتا ہے۔ کھلاڑیوں کے بچے کھیل کے میدان میں اپنا نام پیدا کر سکتے ہیں، اور کاشت کار کے بچے کاشتکار بن جائیں تو کوئی بری بات نہیں ہے۔ تو پھر سیاست دان کی اولاد اگر سیاست کے میدان اترنا چاہے تو یہ کوئی ایسی بھی بری بات نہیں ہے۔ معیار تو اخلاق و کردار ہی کو مقرر کیا جا سکتا ہے۔ کسی شخص کے آباؤ اجداد کا غیر سیاسی ہونا سیاست کے لئے اس کی نااہلی کی بنیاد قرار نہیں دیا جانا چاہئے۔ بالکل اسی طرح کسی کے بزرگوں کا سیاسی کردار سیاست میں داخلے کی ممانعت کی وجہ قرار دینا انصاف نہیں ہے۔ سیاست میں موروثیت کا اس حد تک تو میں بھی مخالف ہوں کہ جاگیردار کا جو بچہ عملی زندگی میں کبھی کچھ نہیں بن سکتا اور گھر میں سب سے نالائق ہوتا ہے، اسے اپنے حلقہ اثر کا استعمال کرتے ہوئے، سیاست میں لا کر لوگوں پر مسلط کر دیا جاتا ہے۔ مگر صلاحیت اور میرٹ کی بنیاد پر کوئی شخص اگر عوام کی نمائندگی کرنے کے لئے خود کو پیش کرتا ہے تو اسے پدرانہ سیاست کی بنیاد پر نااہل قرار دینا بھی جائز نہیں ہے۔

قارئین! آپ نے دیکھا عامر بن علی کس طرح بات سے بات نکالنے کا ماہر ہے چلتے چلتے میں بھی بتاتا چلوں کہ..... میرے والدِ گرامی لطیف ادیب اور دادا جان چراغ الدین محمد دائم استاد شاعر تھے اور میں بھی الحمدللہ.....

امریکہ بہادر میں اگر جارج بش کے بعد اس کا بیٹا جارج ڈبلیو بش صدر بن سکتا ہے اور کلنٹن کے بعد اس کی بیوی ہیلری کلنٹن صدر بننے کی کوشش کر سکتی ہے تو پھر شریف فیملی اور بھٹو خاندان کی نئی نسل میں سے اگر کوئی عوامی حمایت کی بنیاد پر سربراہ مملکت چن لیا جاتا ہے تو اس میں کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہونی چاہیے۔ دنیا کا کوئی کونہ ایسا نہیں جہاں مخصوص خاندان جمہوری سیاست کے ساتھ اس طرح منسلک نہ ہوں جیسے ہمارے ہاں موجود ہیں۔ بنیادی بات یہ ہے کہ موروثیت سیاست میں اہلیت یا نااہلی کی بنیاد نہیں ہونی چاہیے۔ چلتے چلتے عرض کرتا چلوں کہ جاپان کے موجودہ وزیراعظم شنزو آبے کے دادا بھی دوسری جنگ عظیم کے ہنگام وزیر دفاعی پیداوار تھے اور جنگ کے کچھ سال بعد جاپان کی وزارت عظمیٰ کے عہدے پر بھی فائز رہے تھے۔

نازبٹ کی وارفتگی ''گنبد ذات کی بازگشت'' ہے

اکرم کنجاہی

دنیا کا اعلیٰ ترین ادب ''وجودِ زن'' سے منعکس ہونے والی دھنک رنگی سے جمالیاتی تصورات کشید کرتا رہا ہے۔ کبھی دھرتی کو ''ماں'' کہہ کر اُس کے عظیم ترین روپ کا اعتراف کرتا ہے، کبھی وینس اور سائیکی، کبھی درگا، سرسوتی اور لکشمی قرار دے کر اُس کی پرستش کرتا رہا ہے۔ ہمارا اُردو ادب ہو یا علاقائی ادبی اثاثہ ''آہ'' اور ''واہ'' تک پہنچ ہی نہیں پاتا جب تک کہ شعر و ادب کی تصویر کو نسائی رنگوں سے دل آویز نہ کر لے مگر دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ اُس کا رُوپ دیوی کا ہو یا داسی کا اُسے فکر کو اظہار کا روپ دینے سے پہلے مرد کے برعکس گردو پیش کے معیارات کی چھلنی میں چھاننا پڑتا ہے مبادا مرد اساس سماج اور معاشرہ قبولیت سے انکار ہی نہ کر دے۔ اگرچہ گزشتہ ستر اسی برسوں میں ہمارے ہاں نسائی اظہار نے کئی نشیب و فراز دیکھے ہیں مگر ہم ابھی تک ایک نیم قبائلی معاشرہ ہیں جہاں شاعرات کو کسی باطنی کشمکش کا انکشاف یا رومانی اور جذباتی حسن کاری کرتے وقت ادبی ڈگر پر سنبھل کے چلنا پڑتا ہے۔ یہ شعوری احساس رفتہ رفتہ اُن کے مزاج کا حصہ بن جاتا ہے۔

گو آج کی شاعرہ بڑی حوصلہ مند ہے، اُس نے اپنی مستقل جدوجہد سے مملکتِ سخن سے بے دخلی کے امکان کو ختم کر دیا ہے۔ اپنی تخلیقات کے ذریعے اپنا شخصیت کے اثبات کا یقین دلایا ہے۔ پھر بھی شعرا جس خیال کو بڑی ڈھٹائی سے جزوِ شعر بنا لیتے ہیں، شاعرات کو وہاں پہلو بچا کر گزرنا پڑتا ہے۔ گفتنی بھی اُس کے لیے ناگفتنی بن جاتی ہے۔ نازبٹ ہمارے عہد کی ایک معروف شاعرہ ہے۔ اُس کے ہاں بھی ایسے کئی مقامات پر اظہار و بیان میں جارحانہ نہیں مدافعانہ رنگ نمایاں ہے۔ اُس کے نزدیک لفظ تلواریں ہیں مگر پھر بھی وہ کہتی ہے ''مجھے خاموش رہنے دو۔۔۔۔ مجھے کچھ بھی نہیں کہنا''

سکھائی ہے مجھے حالات نے اداکاری
سو میری بات سے کھلتا نہیں ہے حال مرا (شبنم شکیل)
ساری عمر خموشی میں کٹ جاتی ہے
آہ چھپانی پڑ جاتی ہے آنکھوں میں (نازبٹ)

نازبٹ نے نظم و غزل دونوں میں بھرپور طبع آزمائی کی ہے۔ ایک ہی فضا میں نظم کی طرح مربوط غزلیات بھی کہی ہیں، اُس کی غزل و نظم کے موضوعات ایک سے ہیں مگر عمیق مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ نازبٹ کی نظم کا کینوس وسیع ہے۔ نثری، معریٰ اور آزاد نظم کو کامیاب بنانے میں شاعرات کا کردار شعرا سے بھی اہم رہا ہے۔ اُس کے پہلے شعری مجموعہ ''وارفتگی'' میں نثری نظم تو مجھے پڑھنے کو نہیں ملی لیکن اُس کی معریٰ اور آزاد نظم نے اپنی ڈکشن اور فکری تنوع کے اعتبار سے مجھے غزل سے زیادہ متاثر کیا ہے۔ اس لیے کہ اُس میں ایک تخلیق کار کی تخلیقی کمٹمنٹ زیادہ نظر آتی ہے۔ نظم مختصر ہو یا طویل اُس میں انتشار یا بے سمتی نہیں۔ فکری بہاؤ اور معنوی ربط کے ساتھ ایک مکمل وحدتِ خیال موجود ہے

تخلیقات میں جمالیاتی شعور اپنی جگہ مگر اُس نے نظم میں اپنے عہد، ماحول اور معاشرے کے ساتھ جذباتی وابستگی کا ثبوت دیتے ہوئے، نظم کی صورت میں کئی شہکار شہر آشوب تخلیق کیے ہیں۔ معاشرتی و سماجی مسائل ہوں یا معاشی تضادات، اُس کے احساسات کی لو نظم میں تیز ہے۔ آدم زاد خالقِ کائنات کی عظیم تخلیق ہے مگر اُس نے منافقت، دوغلے پن، خودغرضی، خود پرستی، کالچ اور لوبھ میں ہر ذی روح کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ یہ واحد جاندار ہے جو اپنے ہم جنسوں پر ظلم و ستم روا رکھتے وقت بصارت اور بصیرت کو شرمندہ کر دیتا ہے۔ اُس نے نظموں میں اِس موضوع کا کامیابی سے احاطہ کیا ہے۔

اُس کی نظموں میں تخلیق کی کہیں پُراسراریت یا ابہام نہیں بلکہ آخری لائنیں کامل طور پر قاری کے ذہن پر پورا تاثر مرتب کر رہی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک مرتب ذہن نے تراشی ہوئی لائنیں صفحہ قرطاس پر منتقل کر دی ہیں۔ کہیں اظہار و ابلاغ کی تشنگی نہیں رہنے دی۔ اس لیے کہ یہ دماغ سے نہیں دل سے کہی گئی ہیں۔ شاعرہ کی اپنے سماج اور معاشرے سے جذباتی وابستگی نے گداز پیدا کر دیا ہے، عصری صداقتوں کے اظہار کی کڑواہٹ کو لفظیات کی گھلاوٹ اور اسلوب بیاں کی مٹھاس نے تاثیر میں بدل دیا ہے۔ کارل گستاؤ ژولنگ کے الفاظ کی صداقت گواہی دے رہی ہے کہ کوئی ماورائی قوت نے اُس کے قلب و ذہن پر قبضہ کیا ہوا ہے اور یہ جابر حاکم کی طرح اُس لکھنے پر مجبور کر رہی ہے۔ اس میں شعور کا عمل دخل نہیں یہ عطیہ بن مانگے عطا ہوتا ہے۔ نازبٹ نے اپنے فن کی لہو رنگ اشکوں سے آبیاری کی ہے۔ نمو تو ہوگی۔

اُس کی نظموں میں ردیف قافیے کی حکم رانی نہیں ہے۔ نظم میں بتدریج ختم ہوتی ہوئی ہیئت کی پابندیوں سے فائدہ ضرور اٹھایا گیا ہے مگر قافیے ردیف کی نہیں تو بحر کی پابندی کی ہے۔ کہیں کہیں بحر کے

ارکان میں کمی بیشی بھی کی ہے۔ یوں اُس کے ہاں معریٰ اور آزاد نظم نے فروغ پایا ہے۔

اس نے شہر آشوب رقم کیے ہوں یا جذباتی و رومانی نظموں کی صورت میں اظہارِ ذات و انکشافِ ذات کیا ہو، ہر طرح کا جذباتی دفور کسی نہ کسی سانچے کا پابند دکھائی دیتا ہو، جو اِس بات کی واضح دلیل ہے کہ وہ فنی حوالے سے ایک پختہ کار شاعرہ ہے۔ جسے بیان کو وسعت دینے کے لیے نثری نظم جیسے کامل لچک دار سانچے کی ضرورت نہیں پڑی۔

''وارفتگی'' مردانہ اسلوب یا لب و لہجے کی شاعری نہیں۔ مخصوص نسائی حسیات اور لمسیات پر مبنی کلام ہے۔ عورت کے جذبات و احساسات کی کومل ترجمانی ہے۔ اِس میں ''اپالو'' کے تیر اور ڈھال نہیں، وینس کا حسن قاری کو سحر میں مبتلا کرتا ہے مگر یہ حسن نسائیت کا اسلحہ خانہ نہیں اظہار کی کوملتا سے پھوٹتا ہے۔ نازبٹ کی غزل میں فکریات کی متنوع دھنک نہ سہی مگر کراں تا کراں محبت کا پھیلاؤ ہے، محبت کے رنگا رنگ شیڈز ہیں، جمالیاتی طرزِ احساس، خمارِ عشق کے تلذذ میں مبتلا رانجھارانجھا کرتی وارفتگی اور سپردگی من تو شدم ہوا چاہتی ہے، فہمیدہ ریاض نے تو کہا تھا کہ وہ پتھر سے وصال مانگتی ہے کیوں کہ آدمیوں سے کٹ گئی ہے مگر یہاں وحدتِ تصور ہے۔ دل کے چمن زار میں کبھی تو پھول بن کھلے ہی مرجھا جاتے ہیں کہ وہ مہرباں ہاتھ کے لمس کی منتظر ہی رہتی ہے تو کبھی خواب و خیال کی وادیوں میں لمس کے ذائقے ہیں جو گوشہ ہائے دل میں گلہائے نو دمیدہ سے اپنی بہار دکھا رہے ہیں اور شعری فضا مزاجِ یار کے گرم و سرد موسموں سے عبارت ہے، نازبٹ کے ہاں وصل کی کیفیات کا بیان بہت حد تک سحر علی 'تمہارے غم کے موسم میں'' کی نظم ''وصل'' میں ہے۔ اپنے لغوی معنوں کے برعکس ہماری شاعری میں یہ لفظ عام طور پر خواہش کی عدم تسکین، ناتمامی اور ناآسودگی کا اظہار بھی ہے۔

بہت ساری شاعرات کے برعکس اُس کے ہاں وصل اور اُس کے تلازمات کا بیان واشگاف نہیں ہے۔ اسلوبِ بیاں نسوانی ہے، اُس لیے ناگفتنی سے اغماز برتا ہے اور انگڑائیوں سے یا بدن کے ٹوٹنے سے تمناؤں کے شیشے ٹوٹنے کی بات نہیں کی۔ اُس کی غزل کا غالب رنگ خصوصی ہے کہ وہ حسن کو ایک ''قدر بالذات'' کے طور پر سامنے لاتی ہے یعنی فن پارے کا جمال از خود ایک مقصد ہے اور دوسرے کسی اعلیٰ مقصد کے حصول کا ذریعہ نہیں۔ یہاں جمالیات سے مراد ازلی حسن نہیں بلکہ ارضی، فنی اور فطری حسن ہے۔ گویا عشق کی مسافت کے سارے منظروں کا بیان ہے مگر نسائی لہجے میں۔

ایسے لب و لہجے میں کہ احمد ندیم قاسمی کو فنون میں کچھ شائع کرنے سے پہلے شاعرہ کو یہ نہ لکھنا پڑے کہ ''بی بی آپ اچھی شاعرہ ہیں مگر ہم لندن میں نہیں لاہور میں ہیں''۔

اُس کی نظم بہت حد تک اجتماعی قدروں کی ضوفشانی سے لو پاتی محسوس ہوتی ہے۔ یوں تخلیق کار ایک ہی ہے مگر فکری سطح پر اُس کے ہاں تخلیق پانے والے شعری سرمایہ نظم میں ایک طرف موضوعی رومانی و جمالیاتی طرزِ احساس اور دوسری طرف معروضی انداز میں تلخ معاشرتی صداقتوں اور حقیقتوں کے ذائقے سے بھی آشنا کرتی ہے۔

''وارفتگی'' کے لغوی معنوں سپردگی، بے خودی اور بے خبری پر غور کیا جائے یا اُس کی غزل اور مخصوص نظموں کا فکری جائزہ لیا جائے۔ ''محبت آنی جانی ہے'' اور ''انتظار'' جیسی نظمیں ثابت کرتی ہیں کہ اُس کی شاعری کا اساسی حوالہ جنس مخالف کا وہ ہی روپ ہے جسے کبھی دوست، محبوب یا شریکِ حیات کہتے ہیں۔

ساتھ ہوتے ہو تو لگتے ہیں زمانے اپنے
ایک رشتے میں سمٹ آتی ہے دنیا ساری

چھپائیں کس طرح آنکھیں چمک محبت کی
اِن آئنوں میں ہے ہر دم جھلک محبت کی

دھڑک رہی ہے کوئی یاد سرخ پھولوں کی
جھپک رہی ہے دلوں میں پلک محبت کی

اے ابرِ وصل برس اور کھل کے مجھ پہ برس
میں بھیگی بھیگی ہوا کی شرارتوں میں رہوں

تم نے لمسِ معتبر سے بخش دی وہ روشنی
مجھ کو میری آرزوؤں کی سحر لگتے ہو تم

وہ اک چراغ جو اُس لمس نے جلایا تھا
مرے بدن میں سدا اُس کی روشنی ہی رہی

تجھ کو سوچوں میں سو بہ سو ہو کر
میں تو بس رہ گئی ہوں تو ہو کر

نہ خواہشِ وصل و کیف و مستی، نہ کوئی لالچ نہ خود پرستی
نہ جانے کس کیفیت میں گم ہوں، بلا کے دنیا، مٹا کے ہستی

اُس کے ہاں وہ مضامین موجود ہیں جو ہماری غزل میں شعریت اور تغزل کا بنیادی سبب خیال کیے جاتے ہیں۔ بے تعبیر خواب، ناآسودہ خواہشات، ہجر و فراق کا ثمر بنتے ہوئے رتجگے، شکوہ و شکایت، بے وفائی و نارسائی، انتظار و خواہش وصال، کربِ تنہائی کی وہی کیفیت ''کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ والی'' اُس کے کلام کا غالب رنگ نہ سہی مگر کہیں کہیں قنوطی رنگ بھی نظر آ جاتا ہے۔ لیکن اِس قنوطی رو، ذاتی تجربات اور شخصی ناآسودگیو اُس نے تخلیقی اظہار کے لیے مستقل پژمردگی کا غیر مرئی گرداب نہیں بننے دیا

اور اپنی نظم میں غمِ ذات کو آشوبِ آگہی میں بدل دیا ہے۔ یوں اپنی ذات کی الجھنوں اور حسرتوں کو گرداب کی صورت میں زنجیرِ پا کرنے اور منجدھار میں گم ہو جانے کی بجائے، وہ اعلیٰ مقاصد کا چپو چلاتے ہوئے آگے بڑھ گئی ہے۔

ترا نصیب بنوں تیری چاہتوں میں رہوں
تمام عمر محبت کی ساعتوں میں رہوں
خمارِ حسرتِ دیدار میں رہوں ہر دم
سوادِ عشق یونہی تیری مدتوں میں رہوں
تو نے ہر گام جو بخشے تھے اندھیرے مجھ کو
اُن اندھیروں میں ترے خواب اُجالے میں نے
قدم قدم پہ یقیں کر رہے تھے ہم اُس کا
قدم قدم پہ محبت فریب دیتی رہی
کسی کے وعدہ و خوش کُن کا پاس تھا ہم کو
کسی کی چشمِ عنایت فریب دیتی رہی

ان کی غزلوں سے چند اشعار اور دیکھیے :

دل و نگاہ کی حیرت میں رہ گئے ہیں ہم
خُمارِ خواب کی لذت میں رہ گئے ہیں ہم
ہوا کے ساتھ کہاں تک گلاب جا سکتے
بکھر کے راہِ محبت میں رہ گئے ہیں ہم
ہمیں تلاش رہا تھا وصال کا لمحہ
کسی کے ہجر کی ساعت میں رہ گئے ہیں ہم

اپنی نظم ''مجھے کچھ دیر سونے دو۔۔۔'' میں لکھتی ہے

'سنو جاناں! میں اپنی آنکھیں بند کرتی ہوں
تو اُن مخمور لمحوں میں۔۔۔۔تمہارے ریشمی احساس کی
اک نرم سی خوشبو نواحِ جسم و جاں میں پھیل جاتی ہے۔۔۔۔۔
فضا مہمیز ہوتی ہے۔۔۔اسی ساعت ہوائے نیم شب
رِمل سُروں میں گنگناتی ہے۔۔۔تمہاری یاد آتی ہے۔۔۔۔
تمہاری یاد آتی ہے تو میری آنکھ کی پُتلی میں رقصاں
تتلیاں مجھ کو ستاتی ہیں
بدن میں پھیل جاتی ہیں
سنو جاناں مجھے کچھ دیر سونے دو۔۔۔۔
وصال آثار لمحوں کا پتہ دیتی گلابی تتلیوں کے لمس کو
محسوس کرنے دو۔۔۔
مجھے کچھ دیر سونا ہے۔۔۔۔ مجھے کچھ دیر سونے
دو۔۔۔!!''

اُس کی نظمیں ''خواہشوں کے صحرا میں''، ''کونج کا سفر''، ''بنجر زمیں کا خوب''، ''سراب''، ''رات ڈھلنے لگی''، ''گلابی بارش''، ''گلابی خواب'' اور ''شکوہ'' بھی اسی محبت، ہجر و فراق، نارسائی، تنہائی، نا آسودگی اور انتظار کے پس منظر میں لکھی گئی ہیں۔ نظم ''الاماں۔الاماں'' اور ''سنو ہمدم'' میں اُس نے بڑے کرب کے ساتھ خواب اور تعبیر کے درمیان کی مسافت کے زندگی کے درد و غم بیان کیے ہیں۔

نظم ''شکستہ وجود'' سے چند مصارع ''پڑے ہیں خواب مرے آرزو کے مقتل میں۔۔۔۔لہو میں ڈوبی ہوئی خواہشیں تڑپتی ہیں۔۔۔نگل رہے ہیں مرے خواب میری آنکھوں کو۔۔۔۔میں چیختی ہوں تو آواز روٹھ جاتی ہے۔۔۔۔کہ اب تو غم مرا دیوار بھی نہیں سنتی۔۔۔کہاں پہ آ گئی میں کانچ جیسا دل لے کر۔۔۔۔قدم قدم پہ جہاں وحشتیں مقابل ہیں۔۔۔۔ہر ایک ہاتھ میں پتھر ہے اور کچھ بھی نہیں''

ناز بٹ کو موضوعاتی شعر کہنے میں بھی خاصی دسترس حاصل ہے۔ یہ اُس کی فن کارانہ ہُنر مندی اور زرخیز ذہن کا ثبوت ہے۔ کہیں وہ اپنی پاک دھرتی کی محبت میں نغمہ سرا ہے، اِس کی مٹی کی بو باس سے مشامِ جاں کے معطر کر لینا چاہتی ہے اور دھرتی ماں پر اپنی محبتیں نچھاور کر دینا چاہتی ہے،

اُسے بزرگوں کی تہذیب نے یہ ورثہ بھی عطا کیا ہے کہ وہ قوم کے محسنوں کی عظمت کے گیت گاتی ہے۔ اُس نے ذات و کائنات اور وطن اور معاشرے کے ساتھ ساتھ اپنی ذات سے قریب تر ہستیوں کو بھی فراموش نہیں کیا۔

اپنے پہلے مجموعہ کلام کو ماں باپ، شریکِ حیات اور بچوں کے نام منسوب کیا ہے۔ ''ماں'' کے لیے اُس کا اظہارِ محبت و عقیدت اتنا ہی خوبصورت ہے جتنا نوشی گیلانی کی نثری نظم ''ورثہ'' یا ثمینہ راجہ کی نثری نظم ''مری معصوم ماں'' میں پڑھنے کو ملتا ہے۔ وہ ایک طرف اپنی ماں کی قربانیوں کا اعتراف کرتی ہے تو دوسری طرف اپنے بچوں کے مستقبل کے لیے بے چین ہو جاتی ہے۔

اُس کی شاعری رشتوں ناتوں کی محبت میں گندھی ہوئی شاعری ہے۔ وہ اُن محبت افروز لمحات کو سرمایہ حیات بنائے ہوئے ہے جو اپنی محترم و پیاری پیاری شخصیات کے ساتھ بسر ہوئے۔ ہمارے عہد کی ایک معروف شاعرہ ''رخسانہ نور'' کے لیے بھی دردِ محبت کے جذبات سے مملو نظم کہی ہے۔

اُس نے علالت کے دوران لکھی گئی نظم ''مرے مالک کرم کر دے'' کے ابتدائی حصے میں اپنی بے بسی کا اظہار کیا ہے اور پھر ذاتِ باری تعالیٰ سے مخاطب ہو کر حسرت سے کہہ رہی ہے ''مرے مالک۔۔۔۔میں مرنے سے نہیں ڈرتی۔۔۔

تری رحمت پہ ہے ایمان میرا۔۔۔۔۔۔میں ڈرتی ہوں، مرے بچے ادھورے ہی نہ رہ

جائیں۔۔۔۔۔"

آگے چل کر اپنی بیٹی سے متعلق کہتی ہیں۔

" مری گڑیا کی آنکھوں میں کئی سپنے سجے ہیں۔۔۔۔

میں انہیں تعبیر دینا چاہتی ہوں۔۔۔

میں اُس کی مانگ تاروں سے بھرنا چاہتی ہوں۔۔۔۔۔۔۔

تری رحمت۔۔۔۔تری برکت سے اپنے شاہزادوں کو۔۔۔۔فلک کی وسعتوں سا نام دینا چاہتی ہوں۔۔۔

میں جینا چاہتی ہوں!!

مرے مالک کرم کردے۔۔۔میں جینا چاہتی ہوں۔۔۔۔"

نازبٹ ایک سچی شاعرہ ہے۔اس لیے اُس کا ذاتی کرب، شخصی نارسائی اور انفرادی شکستگی، بے شک اُداسی میں تو ڈھلتی ہے مگر جلد بہت متوازن لہجے میں عصری آگہی میں بدل جاتی ہے۔کیوں کہ اُس کے ہاں حساس کی لو تیز ہے۔سچی تخلیق میں اپنا ہی نہیں پرایا درد بھی قاری اور سامع کے دل کے تاروں کو چھڑتا ہے۔اُس نے اپنوں کے دکھ سکھ کو بھی اپنا جانا ہے۔زندگی کے منظروں کو کھلی آنکھ سے دیکھا ہے۔لہجہ انقلابی و ترقی پسندانہ نہ سہی مگر اُس نے گردو پیش کے ماحول، استحصالی معاشرے اور معاشی تضادات سے بھرپور سماج کی سفاک حقیقتوں اور سچائیوں اور عصرِ حاضر کے خودغرض انسان کی مفاد پرستی، چیرہ دستی، اور طوطا چشمی جیسے کڑوے کسیلے موضوعات پر بھی شیریں اسلوب بیاں سے بات کی ہے۔

اُس کے ڈکشن کی کومل کلام کو بوجھل نہیں بننے دیتی اور حرفِ صداقت ساعتوں پر گراں نہیں گزرتا۔اُس کے ہاں کسی بھی آشوب عصر کا بیان عزم وحوصلے کے ساتھ انقلابی انداز میں نہ سہی، اِس پر حزن و ملال کا رنگ بھی غالب نہیں۔درد و گداز ہے جو با وقار، پُر تاثیر اور اپنا اپنا سے لگتا ہے۔

اپنی آزاد نظم "سوال" کے ابتدائی حصے میں اُس نے کمال محبت سے تلمیحات کا استعمال کرتے ہوئے خدا کی کبریائی اور قدرت بیان کی ہے، دوسرے حصے میں اجتماعی دکھ درد کا اظہار کیا ہے اور آخر میں بارگاہِ ربانی میں ایک تلمیح کا استعمال کرتے ہوئے یہ "سوال" چھوڑ دیا ہے:۔

"تنے میں اب درختوں کے پناہیں کیوں نہیں ملتیں۔۔۔۔

سہارا دینے والی بانہیں نرم کیوں نہیں ملتیں"

اِس نظم کی تلمیحات ظاہر کرتی ہیں کہ اُس نے ظہورِ اسلام سے پہلے اور بعد کی تاریخ کا مطالعہ کر رکھا ہے۔

نظم "اندھے شہر کے لیے دعا" میں اِس عہد کا ایک المیہ رقم کرتی ہیں:۔

'یہ ادھ کھلی بے حجاب کلیاں۔۔۔جو پھول بننے کی آرزو میں۔۔۔خود اپنی خوشبو گنوا چکی ہیں۔۔۔

ہوس زدہ بھیڑیوں کے پنجوں میں بانکپن ہی لٹا چکی ہیں"۔۔۔۔

وہ دنیا جسے انہوں نے "سانپوں کا نگر۔۔" بھی لکھا ہے۔۔۔۔۔اِسی دُنیا کے لئے اپنی اِسی نظم کے آخر میں یوں دعا گو ہیں:

۔"مرے خدایا!۔۔۔تمام آنکھوں کو نور دے دے۔۔۔نہیں معافی کے مستحق سب

مگر اے ربِ غفور دے دے۔۔۔۔۔۔۔!!

چند اشعار دیکھیے :

چاروں طرف سناٹے نے چپ پڑی نوحہ کناں ہے زندگی
گر چکے دیوار و در، بے سائباں ہے زندگی

کسی بھی سمت کوئی دل کشا منظر نہیں ملتا
وفا کے شہر میں احساس کا پیکر نہیں ملتا

ہمارے چار طرف تیرگی کا سایہ تھا
ہماری آنکھ میں کیسے کوئی سحر آتی

نظم "بونے لوگ" ملاحظہ کیجیے:۔

"لب پر میٹھے میٹھے بول۔۔۔دل میں کینہ بغض ریا۔۔۔

نیت میں ازلوں سے کھوٹ۔۔۔

لفظوں کا بیوپار کریں۔۔۔مطلب ہو تو پیار کریں۔۔۔

جھوٹے دعوے یاری کے۔۔۔شعبدے ہیں مکاری کے۔۔۔

وقت پڑے تو کھل جاتے ہیں۔۔۔اونچے قد کے بونے لوگ!!"

رگوں میں زہر بھرنے کا گلہ کیوں کر کسی سے ہو
کہ ہم نے سانپ خود ہی آستیں میں پال رکھے ہیں

میں نے اپنے خدا پہ چھوڑ دیا
فیصلہ آستیں کے سانپوں کا

معاصر اُردو غزل کا نمایندہ شاعر.....ارشاد نیازی

ساحل سلہری/سیالکوٹ

جدید اُردو غزل عہد بہ عہد کروٹیں بدلتے ہوئے جب اکیسویں صدی کے دوسرے دہے میں داخل ہوئی تو متنوع موضوعات واسالیب کے اعتبار سے نصف صدی آگے سفر کرتی محسوس ہوتی ہے۔معاصر غزل نگاروں نے اس صنف کو اس طرح برتا ہے کہ اس کے خدوخال واضح طور پر نئے نویلے لگنے لگے ہیں۔اپنی اس رائے کو صادق بنانے کے لیے مجھے ''دلاسا'' کا حوالہ دینا پڑ رہا ہے۔''دلاسا'' معاصر اُردو غزل کے نمایندہ شاعر ارشاد نیازی کی غزلوں کا اولین مجموعہ ہے جو گذشتہ دنوں میرے ہاتھ لگا۔سیال کوٹ کے تاریخی قصبہ چوبارہ میں مقیم اس کہنہ مشق شاعر نے اپنے کمال فن اور پختہ گوئی سے معاصر شعرا میں اپنا منفرد مقام بنالیا ہے۔

ارشاد نیازی کی شاعری میں شہر اور گاؤں کی علامتیں ملتی ہیں۔شہر دراصل ان کے یہاں جدید اور ترقی یافتہ تہذیب کا استعارہ ہیں اور گاؤں پرانی تہذیب اور روایت کی طرف اشارہ ہیں۔ان کی شاعری چلتے چلتے کچھ وقت کے لیے ماضی کی طرف بھی مراجعت کر جاتی ہے۔یہ شعر دیکھیے:

شہر سے دور ایک گاؤں کا
پیڑ گریہ کریں گے چھاؤں کا

.....

شہر تعبیر کی جھلک دیکھوں
خواب ادھڑتے میں کب تلک دیکھوں
گرد اوڑھے بدن پہ خستہ حال
سبز گاؤں تری سڑک دیکھوں

ارشاد نیازی کی غزل میں صبح، شام، رات، دن، تیرگی، روشنی، چراغ، ہوا، چاند، تارے، شب، پیڑ پرندے، فاختہ، دشت، دریا اور ہجر و وصال جیسے الفاظ کا استعمال نئے مفاہیم، تلازموں اور موضوعات سے متشکل ہوا ہے۔اس کے یہاں بدن کے پنجرے، صبح بدن کی شاخ، خوشبو کے شب کدوں، حروف اوندھے پڑے ہیں، روشنی اونگھ رہی ہے، چراغوں کی پشیمانی، پرندگی کی سہولت، دن کی منڈیروں پہ، خامشی پھانکتے، خامشی کی چڑی ادھیڑنا، چہک سینچ رہے ہیں، آنکھ کے کوزے، سسکتا وصل اور پپڑی کا گریہ کا استعمال انتہائی نیا ہے۔ارشاد نیازی کی غزل کا آہنگ، اسلوب اور موضوعاتی رنگا رنگی ملاحظہ کیجیے:

سکڑتے ہاتھ کی دستک میں گر اثر ہوتا
پرائے ہجر کی دیوار تجھ میں در ہوتا
یہ میری آنکھ یہ عجلت میں نیند مرتی ہوئی
یہ میرے خواب یہ حیرت زدہ سفر ہوتا
صدائیں دیتی مجھے سبز منزلِ مژگاں
خموش، سرخ گلی، شور کرتا گھر ہوتا

.....

نیند تو میں کما کے لاتا ہوں
خواب لیکن چرا کے لاتا ہوں
تم شجر کو ذرا دلاسا دو
میں پرندے بلا کے لاتا ہوں

ارشاد نیازی کی غزل سماجی رویوں کی عکاسی کرتی ہے۔وہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اس طرح اپنی شاعری کا موضوع بناتا ہے کہ شعریت بھی شعر سے خارج نہیں ہوتی۔وہ اپنے تجربات، مشاہدات اور احساس کو شاعری کے ذریعے بیان کرتا ہے۔تیرگی، چراغ، دشت، سفر، پرندے، درخت ارشاد کی شاعری کے استعارے ہیں۔وہ ان میں کھو کر ایک الگ دنیا کا خواب دیکھتا ہے۔فرزاد علی زیرک، ارشاد نیازی کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ارشاد نیازی کا واحد مقصد شعر کو محض زبان کا چٹخارہ بنا دینا نہیں ہے۔وہ گھمبیر موضوع لاتا ہے اور اسے اپنی مرضی کی کرافٹ سے اپنی پسند کے سانچے میں ڈھالتا ہے۔انفراد کا خمیر لہجے کے تیور سے نہیں بل کہ موضوع کے تنوع اور معنی کی تکثیریت سے اٹھتا ہے اور ارشاد نیازی اس میں مکمل کامرانی کے ساتھ محوِ سفر ہے۔''(۱)

ارشاد نیازی نے اپنے لہجے کی جدیدیت سے روایتی موضوعات کو بھی نیا بنا دیا ہے۔ان کے شعروں کا موضوعاتی تنوع، مصرعوں کی بنت، نشست و برخاست، سلاست، روانی، شائستگی اور غنائیت بہت خوشگوار لگتے ہیں۔یہ اشعار دیکھیے:

روشنی کے سراغ تک پہنچی
جب ہوا اس چراغ تک پہنچی
پیاس آنکھوں کی پتلیوں پہ مری
زندگی جب ایاغ تک پہنچی
اک صدا صبر کی پہاڑی سے
لڑکھڑائی تو راغ تک پہنچی
سوچتا ہوں کہ ادھ مری تتلی
کس طرح کیسے باغ تک پہنچی

ارشاد نیازی معاصر اردو غزل کا معتبر اور صاحب اسلوب شاعر ہے اس کی غزل تخلیقی سچائی کی آئینہ دار ہے۔اس کی غزلوں میں نہ صرف روح عصر رواں ہے بل کہ کئی جذبات اور احساسات سانسیں لے رہے ہیں۔یہ اشعار دیکھیے:

شکستگی کا فسوں آنکھ میں اُتر جائے
قفس کا رنج سہے اور خواب مر جائے
کوئی تو مجھے محبت کی بے زبانی کو
کوئی تو ہاتھ پہ چپکے سے پھول دھر جائے
یہ بین کرتی ہوئی لو چراغِ ہجرت کی
بدن کو چیر دے اور آئنے سے ڈر جائے
بس ایک بار وہ اپنا مجھے کہے تو سہی
وہ اپنی بات سے چاہے تو پھر مکر جائے

ارشاد نیازی کی شاعری میں سیونک کی طرح چاٹنے اور اندر ہی اندر مسلسل چلنے والا درد ہے۔ ارشاد نیازی کی شاعری تخلیقی وفور کی حامل ہے۔ اس لیے اس کی مقبولیت کے امکانات بڑھتے چلے گئے۔ اس نے غزل کو ایک نئے تناظر میں تخلیق کیا ہے اور وہ اپنے رنگ میں غزل کہہ کر سب کو متوجہ کر رہا ہے۔ ارشاد نے غزل کے رواں منظر نامے میں اپنا مقام مستحکم کر لیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کام یاب سعی کی ہے کہ غزل کا سفر ابھی رکا نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ نئی غزلوں کا یہ مجموعہ بھرپور توجہ حاصل کرے گا۔

حوالہ جات:

۱۔ علی زیرک، فرزاد، طلیب، دلاسا از ارشاد نیازی، (لاہور: طلوع اشک پبلی کیشنز، ۲۰۱۹ء)

نعتیں

کیا پوچھتے ہو میری تمنا تمہیںؐ تو ہو
دل کا سکوں نظر کا اُجالا تمہیں تو ہو

کہتا ہے خود خدا جسے پیارا تمہیںؐ تو ہو
ماوٰ عرب تمہیں، شہِ بطحا تمہیںؐ تو ہو

بے وارثوں کے وارث و آقا تمہیںؐ تو ہو
لوٹے ہوئے دلوں کا سہارا تمہیںؐ تو ہو

یہ مہر و ماہ کیا ہیں تمہارا جمال ہے
جس پر خدا بھی ہو گیا شیدا تمہیںؐ تو ہو

کون و مکاں کی بزم تمہارے ہی دم سے ہے
تخلیقِ کائنات کا منشا تمہیںؐ تو ہو

کیوں جد و جہاں کی عظمتیں تم پر نہ ہوں نثار
لد ونوں جہاں میں ارفع و اعلیٰ تمہیںؐ تو ہو

یہ مرتبہ ملا ہے تمہارے ہوا کے
دولہا بنے تھے جو شبِ اسریٰ تمہیںؐ تو ہو

طوفان بھی ہے تیز شکستہ ہے ناؤ بھی
بیڑا لگاؤ پار کھویا تمہیںؐ تو ہو

وہ پوچھتے ہیں خواب میں کس کی ہے جستجو
قدموں میں گر کے کہتی ہوں آقا تمہیںؐ تو ہو

نصرتؔ گناہگار ہے چشمِ کرم کرو
ہر دردمند دل کا مداوا تمہیں تو ہو

.....

تصور میں خیر الانامؐ آ رہے ہیں
زباں پر درود و سلام آ رہے ہیں

جہاں ہو کے گزرے ہیں رُومی و جامی
رہِ عشق میں وہ مقام آ رہے ہیں

بلایا ہے خالق نے عرشِ بریں پر
لئے کہ جبریلؑ لے کر پیام آ رہے ہیں

درود ان پہ بھیجو عقیدت سے نصرتؔ
خدا کے بھی جن کو سلام آ رہے ہیں

بیگم نصرتؔ عبدالرشید

مولانا حامد علی خاں کی یاد میں شاہد علی خاں کی زیرِ ادارت شائع ہونے والا مجلّہ

الحمراء

ادبی صحافت میں مقبولیت کے سنگ میل عبور کرتا ہوا گزشتہ اٹھارہ برس سے ہر ماہ باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے
اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے بک سٹال سے طلب فرمائیں یا ہم سے براہِ راست منگوائیں

رابطہ کے لیے دفتر ماہنامہ الحمرا: j-24 ماڈل ٹاؤن، لاہور 0333-4001844

آصف ثاقب/بوئی ہزارہ

نگاہوں کا کھلونا بن گیا ہوں
نہیں جو دیکھنا وہ دیکھتا ہوں
تری محفل میں ایسا کھو چکا ہوں
نئے چہروں میں خود کو ڈھونڈتا ہوں
تمہارے سامنے اک بت کھڑا ہے
یہاں سے میں تو کب کا جا چکا ہوں
کوئی صورت نظر آئے تو ٹھہروں
ابھی میں آ رہا ہوں، جا رہا ہوں
کوئی تصویر تھا دیوار پر میں
گرے سے اک چھنا کا ہو گیا ہوں
مجھے نفرت سے دیکھا جائے ثاقبؔ
مگر پھر بھی محبت کر رہا ہوں

رستہ خود ہی منزل کو دشوار بنائے
آندھی ریت اُڑائے اور دیوار بنائے
قید سے مجھ کو چھوڑ کے قصد قتل کرے
طوق کو وہ پگھلائے اور تلوار بنائے
سر پر کھیل کے میں نے اوج نصیب کیا
میرا رہبر پرچم کو دستار بنائے
آنکھ اندھیری شب کا استقبال کرے
قطرہ قطرہ موتی چن کر ہار بنائے
رونے کی یہ رُت بھی عظمت والی ہے
بارش مٹی گوندھ کے اک کہسار بنائے
اس کا کاروبار مشینیں کرتی ہیں
کچے کوٹھے روند کے وہ بازار بنائے

ثاقبؔ جو دیوار کے کان میں کہتا ہے
سرخی اس کو شہر کا ہر اخبار بنائے

ہتھیلیوں کے سرابوں کے ڈر میں رہتا ہوں
لکیر بن کے میں تتلی کے پر میں رہتا ہوں
دکھائی دیتے ہیں ہر سمت اجنبی چہرے
مجھے خبر ہی نہیں کیسے گھر میں رہتا ہوں
اسی قیام سے مجھ کو ملی ہمہ گیری
تمہارے پیار کا سودا ہوں، سر میں رہتا ہوں
سیاہ پتوں پہ کرنوں کا جال ڈالوں گا
میں چاند بن کے خیالِ شجر میں رہتا ہوں
میں اک یقین کی صورت پڑا ہوں زنداں میں
مگر گمان کے تازہ سفر میں رہتا ہوں
عذاب لگتی ہیں یکساں شناختیں ثاقبؔ
بدل بدل کے میں اس کی نظر میں رہتا ہوں

نئی تان کیا ہے نیا ساز کیا ہے
پرندہ سمجھتا ہے آواز کیا ہے
مسافت رہی ہے ازل سے ابد تک
وہی جانتا ہے کہ پرواز کیا ہے
محبت میں مرنے کی صورت ہو کیسی
یہ زیدی بتائے گا شہناز کیا ہے
ہوا میں ہے عزمِ سفر آج میرا
خدا جانے عزمِ ہوا باز کیا ہے
ترا رُخ بدلنا عجب ہے سلیقہ
قرینہ قرینہ یہ انداز کیا ہے

میں فرش پہ گر کر خاک ہوا
دیوار پہ ہے تصویر مری

مجھے اپنی بوئی کی بستی ہے پیاری
یہ حافظ ہی جانے کہ شیراز کیا ہے
سب احباب ثاقبؔ یہی پوچھتے ہیں
تجھے چپ لگی ہے بتا راز کیا ہے

ترے بدن سے بلاؤں کے ہاتھ کیسے لگے
قبا کے تار ہواؤں کے ہاتھ کیسے لگے
لکھے تھے نغمہ سراؤں سے ہم نے چھپ چھپ کر
ہمارے گیت صباؤں کے ہاتھ کیسے لگے
ہمارے زخم سجائے گئے ہیں زُلفوں میں
یہ پھول کالی گھٹاؤں کے ہاتھ کیسے لگے
امیر شہر کا دربار کیسے سونا ہوا
غریب لوگ اناؤں کے ہاتھ کیسے لگے
سوال ڈھانپ کے رکھتی تھی دل میں شہزادی
جواب خواجہ سراہوں کے ہاتھ کیسے لگے
حسین لگتی ہے تجھ کو پکار لفظوں کی
مرے خدا یہ دعاؤں کے ہاتھ کیسے لگے
نئی فضاؤں میں تشہیر ہو گئی ثاقبؔ
دلوں کے راز خلاؤں کے ہاتھ کیسے لگے

تدبیر ہے جوئے شیر مری
کیوں مجھ پہ ہنسے تقدیر مری
میں فرش پہ گر کر خاک ہوا
دیوار پہ ہے تصویر مری
سو چھید ہیں جیب و داماں میں
دستار ہے لیر و لیر مری

نسیم عباسی

ایسی ترتیب سے روشن ہیں تری محفل میں

ایک ہی پھونک چراغوں کو بجھا سکتی ہے

اتنا نہ گھوم رات کو پھولوں کی باس میں
سوئے پڑے ہیں چاروں طرف سانپ گھاس میں

ہر سمت اس نے آتشی شیشے لگا دیے
سڑکوں پہ لوگ آئے تھے کالے لباس میں

اس وقت میرے ہاتھ میں برتن نہ تھا کوئی
چلّو سے کام لے لیا شدت کی پیاس میں

یہ اور بات زیرِ زمیں دفن ہو گئیں
ورنہ جڑوں کا خون ہے پھل کی مٹھاس میں

اگلا نصاب نورِ بصیرت سے پڑھ لیا
آنکھیں تو چھوڑ آیا تھا پہلی کلاس میں

آخر وہ ایک بات اُسی سے بنی مری
شامل نہ تھا جو لفظ مرے التماس میں

اب بار بار اس کی طرف دیکھتے ہو کیا
اب صرف میری تشنہ لبی ہے گلاس میں

منظر کسی طلسم کی زد میں نہ ہو نسیم
سرسوں کا رنگ دوڑ رہا ہے کپاس میں

یقین لوٹ کے وہم و گمان دیتا ہے
وہ کافروں کی گلی میں اذان دیتا ہے

یہاں تو شہد کی مکھی بھی خوش نہیں رہتی
یہ شہر چادریں پھولوں پہ تان دیتا ہے

بس ایک روشنی لفظوں کے ساتھ آتی ہے
بس ایک درد غزل کو اُٹھان دیتا ہے

حسین صورتیں دل میں اُتر ہی جاتی ہیں
چکور چاند کی کرنوں پہ جان دیتا ہے

ضرور میں کسی سازش کا ہو گیا ہوں شکار
مرا عدو مرے حق میں بیان دیتا ہے

مرے بزرگ ہیں کردار میں مرے شامل
مرا ثبوت مرا خاندان دیتا ہے

نسیم سمتِ سفر کا شعور ہے مجھ کو
ہوا کے رخ کا پتا بادبان دیتا ہے

اب کے برس بھی یوں ہوئی تقریبِ عید کی
میں نے بس اپنے آپ سے گفت و شنید کی

اس مہرباں کو کاسہ سر پیش کر دیا
دستِ طلب نے آخری کوشش مفید کی

مصروف جب ہوئے تو تری یاد میں ہوئے
فرصت ملی تو تجھ سے محبت مزید کی

تجویز آپ اپنی سزا کر رہے ہیں لوگ
تسلیم کر رہے ہیں خلافت یزید کی

یہ بات کتنی قابلِ افسوس بات ہے
اس نے مرے خلوص کی مٹی پلید کی

مجھ کو بلیک میل کیا ہے سماج نے
پھر بھی منافقت کی مذمت شدید کی

اُمیدوار وہ بھی ہے حورانِ خلد کا
دنیا نسیم جس نے جہنم رسید کی

ذرا جو ننھے پرندے نے پر نکالے ہیں
تو شاخ شاخ سے سانپوں نے سر نکالے ہیں

کیا ہے روئے اُفق پر کمال فطرت نے
خطوطِ شام برنگِ سحر نکالے ہیں

بندھا ہے خلق خدا کا اسی طرف تانتا
جنوں میں راستے ہم نے جدھر نکالے ہیں

یہ شہر کیسے ہنرمند نے کیا تعمیر
گھروں میں کھڑکیاں رکھیں نہ در نکالے ہیں

بطورِ خاص چمن میں ہمارے قد ناپو
کہ ہم نے سائے کے زیرِ اثر نکالے ہیں

پڑے تھے وقت کی الماریوں میں زنگ آلود
سو ہم نے اپنے بدن ڈھونڈ کر نکالے ہیں

ہمارے واسطے صحراؤں میں بگولے تھے
سمندروں میں ہوا نے بھنور نکالے ہیں

نسیم میں نے بہت احتیاط برتی ہے
زمین کھود کے شیشے کے گھر نکالے ہیں

دوست بن کر بھی کہیں گھات لگا سکتی ہے
موت کا کیا ہے کسی روپ میں آ سکتی ہے

ان مکانوں میں لگا رہتا ہے اک دھڑکا سا
اگلی بارش در و دیوار گرا سکتی ہے

ایسی ترتیب سے روشن ہیں تری محفل میں
ایک ہی پھونک چراغوں کو بجھا سکتی ہے

میرا فن میرے خدوخال میں تقسیم ہوا
میری بیٹی مری تصویر بنا سکتی ہے

خوش نہ ہو اتنا کہ یوں روشنیاں پھوٹ پڑیں
اس چکاچوند میں بینائی بھی جا سکتی ہے

باغ میں چاروں طرف اس کی مہک پھیلے گی
پھول سے موجِ صبا شرط لگا سکتی ہے

جو طاقِ تیرہ میں جلتا رہا، چراغ کے ساتھ
وہ میں نہ تھا، تو بھلا کون تھا؟ چراغ کے ساتھ
تمام شب یونہی دیکھا کیا چراغ کی لو
ہوا پھر ایسے کہ میں بجھ گیا، چراغ کے ساتھ
عجیب روشنی پھیلی ہوئی ہے کمرے میں
کہ جب سے آئنے کو رکھ دیا، چراغ کے ساتھ
تمہیں خبر ہی کہاں، میرے کرب کی شدت
تم ایک بار کرو رت جگا، چراغ کے ساتھ
بس ایک میں ہی نہیں اس لپیٹ میں، ساحرؔ
کہ جل رہی ہے مسلسل ہوا، چراغ کے ساتھ

غمِ زمانہ سے فرصت کبھی ملی ہی نہیں
کہ میری خود سے کوئی گفت گو ہوئی ہی نہیں
میں اس گلی سے اُٹھوں بھی، تو اور جاؤں کہاں؟
کہ اس گلی سی کوئی دوسری گلی ہی نہیں
کئی دنوں سے مری خامشی ہے روٹھی ہوئی
کئی دنوں سے مرے ساتھ بولتی ہی نہیں
کچھ اور بڑھ گئی جینے کی آرزو مجھ میں
عجیب پیاس تھی، جو زہر سے بجھی ہی نہیں
میں کیا کسی پہ بھلا بھید کھولتا کوئی
کہ مجھ پہ خود مرے دل کی گرہ کھلی ہی نہیں
یہ تیرگی بھی حقیقت میں ایک روشنی ہے
یہ اور بات، ہمیں اس کی آگہی ہی نہیں
بس ایک بار توجہ سے اس کو دیکھا تھا
پھر اس کے بعد توجہ مری ہٹی ہی نہیں
وگرنہ میں بھی یہاں تم سے دشمنی کرتا
دُعائیں دو کہ مری تم سے دوستی ہی نہیں
جنابِ آدمؑ و حواؑ کی سب کرامت ہے
وگرنہ پہلے یہ دنیا حسین تھی ہی نہیں
میں سوچتا ہوں کہ اس کائنات میں، ساحرؔ
میں کیا وجود کسی شے کا واقعی ہی نہیں؟

کچھ ایسے نظر آئیں ہم اک ساتھ دوبارہ
جیسے مہ شب تاب کے ہم راہ ستارہ
سو غرق ہوا جاتا ہوں میں اس میں مسلسل
ملتا ہی نہیں بحرِ تحیر کا کنارہ
پھر سے شبِ کافر میں کہیں دور فلک پر
ضو دینے لگا کوئی ضیا بار ستارہ
روکے سے کہاں رُکتا ہے یہ قافلۂ وقت
عمرِ گزراں پر ہے بھلا کس کا اجارہ
اس ذاتِ خداوند زمانہ کی قسم ہے
ہر ایک نفس میں نے اُٹھایا ہے خسارہ
بے دار ہوا حالت خوابیدگی سے، جب
لو دینے لگا خود سے شرر بار شرارہ
تم نے جو ابھی آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا ہے
میں خوب سمجھتا ہوں، مری جان اشارہ
اک عمر سے آوارہ و گرداں ہوں میں ساحرؔ
بردوشِ ہوا جیسے فضاؤں میں ظہارہ

عجب فسوں سا ہے، ہونے کا یہ فسوں کہ میں ہوں
خدا نہ کردہ، کبھی اس طرح کہوں کہ میں ہوں
یہ اور بات، کوئی فلسفی نہیں ہوں میں
مگر میں سوچتا رہتا ہی ہوں پھر بھی، کیوں کہ میں ہوں
کسی بھی طور مگر حل نہ ہو سکا اب تک
ہے میرا مسئلہ ذات جوں کا توں کہ میں ہوں
میں جب تلک نہ تھا خود آشنا، مزے سے تھا
پہ ہو گیا ہے مرا دردِ سر فزوں کہ میں ہوں
خود اپنے آپ سے اب مجھ کو خوف آنے لگا
ہے یہ معاملہ یعنی دراصل یوں کہ میں ہوں
مجھے خبر ہے کہ ساحرؔ کہیں نہیں ہوں میں
تو کس لیے میں کوئی اِدّعا کروں کہ میں ہوں

موج زن صورتِ خوں اور بھی اک شے، کوئی ہے
ہو نہ ہو، میرے رگ و پے میں کوئی ہے، کوئی ہے
ہے مرا چھید بھرا جسم بھی اک نے کی طرح
اندرونے میں جو ہے درد بھری لے، کوئی ہے
ایسی وحشت ہے کہ اک عالم تنہائی میں
آپ اپنے ہی سے میں پوچھتا ہوں "اے! کوئی ہے؟"
یوں ہی اک دوجے کی جانب نہیں کھنچتی روحیں
سلسلہ روزِ ازل ہی سے کہیں ملے، کوئی ہے
عشق کے مے کدے کا رند سبو نوش ہوں میں
نہیں سیراب ہوئی تشنگیٔ مے، کوئی ہے
چھپتا پھرتا ہوں میں خود اپنی نظر سے ساحرؔ
ایک مدت سے مری جان کے درپے، کوئی ہے

فریدہ خانم: ملکۂ غزل

ڈاکٹر امجد پرویز/لاہور

فریدہ خانم ؛ ملکۂ غزل:

عظیم غزل گائیکہ فریدہ خانم 1933ء میں کلکتہ میں پیدا ہوئیں اور امرتسر میں پلی بڑھیں (کہ جسے پنجابی رنگ میں رنگا جائے تو امبر سر کہلائے گا)۔ اپنی بڑی بہن مختار سے خیال اور کلاسیکی موسیقی کی تربیت حاصل کرنا ؛ سات سال کی عمر میں شروع کیا۔ بعدازاں مختار بیگم ہی کی صلاح پر فریدہ ؛ استاد عاشق علی خان کی شاگردہ ہوئیں۔ بڑی آپا (بی بی) سات سالہ فریدہ کو خان صاحب کے ہاں ریاضت کو لے جاتیں۔ ان کے خاندان نے بھی 1947ء میں نئے وطن کی جانب ہجرت کی۔ پہلے پہل وہ راولپنڈی منتقل ہوئیں بعد میں صرف 13 برس کی عمر میں ہی ریڈیو پاکستان سے اپنے موسیقی کے سفر کا آغاز کیا۔ اس عرصہ کے دوران فریدہ کا لاہور اور راولپنڈی کے درمیان آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ان دنوں بڑے غلام علی خاں اور ملکۂ موسیقی روشن آرا بیگم کلاسیکی موسیقی کی دنیا پر راج کر رہے تھے۔

مختار بیگم (بی بی)

فریدہ خانم کی فنی خدمات کا تفصیلی جائزہ لینے سے پہلے ؛ ہم اُن کی ہمشیرہ اور دستِ راست مختار بیگم کی فنی خدمات ؛ گائیکی اور فلموں کا ذکر کریں گے۔ فریدہ خانم ؛ پیار سے اپنی بہن کو 'بی بی' کہہ کر بُلایا کرتی تھیں۔ مختار بیگم نے مشہور اردو لکھاری آغا حشر کاشمیری سے بیاہ کیا ہوا تھا۔ انہوں نے نور جہاں کی ' جب وہ کم عمر تھیں ؛ بہت حوصلہ افزائی فرمائی کہ وہ اداکاری اور گائیکی کے عمل کو جاری رکھیں۔ انہوں نے نہ صرف فریدہ خانم بلکہ ایک اور پاکستانی گلوکارہ نسیم بیگم کی رہنمائی فرمائی۔ اس کے علاوہ ؛ انہوں نے پاکستانی اداکارہ رانی کی بھی سرپرستی فرمائی۔ مختار بیگم کی ہندوستانی فلم انڈسٹری کیلئے 1932ء سے 1940ء کے دوران ؛ خدمات بہت زیادہ ہیں ؛ بحیثیت گلوکارہ اور اداکارہ کے۔ سب سے پہلے انہوں نے اسٹیج پر اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے۔ ان کی فلموں کی تفصیل ذیل درج ہے۔

علی بابا اور چالیس چور - 1932ء (معاون اداکار: جہاں آرا بجن۔ نواب اور پیشنس کوپر)

چھترا بکاولی - 1932ء (معاون اداکار: جہاں آرا بجن ؛ مانسٹر نثار اور پیشنس کوپر)

ہتھیلی دلہن-1932ء (معاون ستارے: پیشنس کوپر ؛ عباس ؛ لکشمی ؛ خورشید اور لیلا)

اِندرا سبھا-1932ء (معاون ستارے: ماسٹر نثار ؛ جہاں آرا بجن اور اے آر کاپلی)

ہندوستان-1932ء (معاون ستارے: نرمدا شنکر ؛ مِس روز)

کرشنا کانت کی وصیت - 1932ء (معاون ستارے: جہاں آرا بجن ؛ ماسٹر نثار اور اے آر کاپلی)

مُفلس عاشق-1932ء (معاون ستارے: خورشید ؛ شیلا اور وٹھل داس پنچولیا)

مندرجہ بالا تمام فلمیں ہدایتکار مدن کی کاوش تھیں۔ 1932ء مختار بیگم کیلئے مصروف ترین سال تھا۔ ہدایتکار عبدالرحمٰن کاپکی نے فلم 'شروَن کمار' بنائی جس میں انہوں نے مختار بیگم کے مقابل اداکاری کی۔ معاون ستارے آفندی اور پنا رانی تھے۔ 1933ء میں مختار بیگم کے شوہر ؛ آغا حشر کاشمیری نے دو فلموں کی ہدایتکاری کی ذمہ داری سنبھالی۔ یہ فلمیں تھیں: ' آنکھ کا نشہ ' اور ' چتا منی '! اُسی برس ہدایتکار عبدالرشید کاردار میدان میں اُترے اور انہوں نے مختار بیگم کے ساتھ انوری بیگم۔ علی اطہر۔ مظہر خاں اور بچن کو لے کر فلم ' عورت راج ' بنا ڈالی! مختار بیگم کو کام کی کمی نہ تھی۔ فلم ' نالا درمیانتی ' میں ہدایتکار آغا حشر کاشمیری کی ایک فلم 'رامائن ' میں مختار بیگم کا ساتھ پرتھوی راج کپور۔ اندو بالا اور لیلا نے دیا۔ 1934ء میں مختار بیگم کی صرف ایک تصویر 'سیتا ' منظرِ عام پر آئی۔ یہ ہدایتکار شہراب کیر والا کی فلم تھی۔ معاون ستارے ' دھیرج بھٹہ چاریہ۔ پرتھوی راج کپور اور گل حمید تھے۔ اِسی ہدایتکار نے 1935ء میں مختار بیگم کے ساتھ فلم 'دل کی پیاس ' بنائی۔ معاون ستارے تھے: سُورج رام۔ جہاں آرا بجن۔ کپور اور ماسٹر گاما۔ ہدایتکار روشن لعل شوری کی فلم ' منجو ' مختار بیگم۔ ظہور شاہ اور حُکم سنگھ 1935 ' ء میں بنی۔ ہدایتکار ایم ایل کپور کی فلم 'پریم کی آگ ' 1936ء میں پردۂ سیمیں پر جلوہ گر ہوئی۔ اس فلم کے معاون ستارے بھائی دیسا ' حسینہ ' پران شنکر اور صفدر تھے۔ مختار بیگم کی آخری فلم ' متوالی میرا ' تھی۔ ہدایتکار پرُفُلا رائے کی اس فلم میں سلطانہ بانو ' رنجیت کماری ' کالا اور فدا حسین بھی نظر آئے۔ مختار بیگم نے فلم 'پریم کی آگ ' کی موسیقی بھی ترتیب دی تھی۔ اُن کا انتقال 25 فروری 1982ء کو ہوا۔

فریدہ خانم کا خاندانی پسِ منظر:

فریدہ خانم کی سرپرست اور ہمشیرہ مختار بیگم پر گذارشات کے بعد اب مَیں فریدہ خانم کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالوں گا۔ فریدہ خانم اپنے گھر جو کہ ظہور

الحمرا روڈ پر واقع ہے جہاں وہ اپنی دختر اور بیٹے ، بہو اور ان کے بچوں کے ہمراہ رہائش پذیر ہیں ۔ ان کی شادی صنعت کار امین پراچہ سے ہوئی تھی جس میں سے ان کی پانچ بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ انکی ایک بیٹی اپنے شوہر اور بچوں کے ہمراہ امریکہ میں اور ایک بیٹی کینیڈا میں مقیم ہیں۔ ان کی سب سے چھوٹی بیٹی endocrinology میں ماہر ہے اور آخری اطلاع پر سروسز ہسپتال لاہور میں کام کرتی ہیں اور اپنے شوہر اور بچوں کے ہمراہ رہائش پذیر ہیں۔

کردار اور وضع داری:

اب ہم اُن محرکات پر نظر دوڑائیں گے کہ فریدہ خانم کو کسطرح 2005ء میں صدر پاکستان نے 'بڑے سول ایوارڈ 'ھلالِ امتیاز ' سے نوازا۔ فریدہ خانم کی پہلی عوامی محفل 1950ء میں منعقد ہوئی تھی جسکے بعد انہوں نے ریڈیو پاکستان کے لیئے گانا شروع کیا۔ جہاں سے انہیں عزت و شہرت ملی۔ اُن کی عزت و احترام میں مزید اضافہ ہوا جب اس وقت کے صدر پاکستان فیلڈ مارشل ایوب خاں نے اُنہیں 1960ء کی دہائی میں اپنے فن کے اظہار کی دعوت دی۔ غزل کی بے تاج ملکہ 'فریدہ خانم گذشتہ چار دہائیوں سے اپنے فن کا اظہار کر رہیں ہیں اور آج بھی ان کا ستارہ عروج پر ہے۔ مَیں جب بھی ان سے ریڈیو پاکستان کے ذیلی ادارے سنٹرل پروڈکشن یونٹ یا پاکستان ٹیلی ویژن کارپوریشن میں کسی دُھن کو سُن کر پسندیدگی یا ناپسندیدگی کا اظہار کرتے دیکھتا تو ان کی قابلیت اور ماہرانہ مشاہدے کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکتا۔ اِن مشاہدات سے یہ امر تقویت پکڑتا ہے کہ کسطرح وہ فنکار جن کی بنیادیں مضبوط ہوتی ہیں ، معیاری شاعری و دھنوں کا انتخاب کرتے ہیں! دُرست! غزل کو کسی مخصوص راگ میں دُھن سے نوازا گیا ہے لیکن اُس دھن پر نظرِ ثانی کر کے 'سُروں کے بُنت میں ردوبدل یا ترمیم کرنے یا کسی اور راگ کے سوچنے سے 'کسی اور تاثر کی تلاش میں غزل کی شاعری کے ساتھ انصاف کیا جاسکے 'وہ سوچتیں!

حال میں فریدہ خانم نے اپنی بڑھتی عمر کا تقاضہ پورا کرتے ہوئے اپنا وزن بھی کم کیا ہے۔ میری ان سے آخری ملاقات تب ہوئی جب وہ نور جہاں کی بیٹی ظِل ہما کے جنازے پر تشریف لائیں اور وہ اپنی نم آنکھوں سے یہ سوال کر رہی تھیں کہ ظِلِ ہما تو ان سے بہت چھوٹی تھیں 'تو پھر وہ اِس دنیا سے کیوں رُوٹھ گئیں؟ مناسب حالات میں 'فریدہ خانم ، بڑی خوش مزاج خاتون ہیں 'خاص طور سے جب وہ دوست احباب 'ٹی وی یا ریڈیو میں اپنے ساتھیوں سے گفتگو کرتی ہوں۔ اگرچہ چند برس پیشتر وہ ٹی وی کے صاحب اقتدار افسران کی اُس سوچ سے گِلہ کرتے نظر آتیں 'جو انہیں نظر انداز کیئے ہوئے تھے۔ شاید یہ بھی وجہ ہو کہ اب شہنشاہ نواب جیسے پروڈیوسر اب حیات نہیں ہیں 'جو ان کے مزاج کے مطابق چل سکتے تھے۔ اُن کو ریہرسل پر بلانے کے بعد گھنٹوں انتظار کرتے پھر غزل کی ریکارڈنگ اور کیمرے سے عکس بندی کرتے! مَیں 1970ء کی کامیاب غزل سیریز " تغزل" کر رہا ہوں۔ یہ وہ دَور تھا جب 1970ء سے 1990ء کی دہائیوں میں پاکستان ٹیلی ویژن کی موسیقی کا اپنا ایک تشخص تھا۔ یہ ماحول 'یہ خوشبو کہیں اُڑ گئی لگتی ہے۔

اگرچہ موجودہ دَور میں پُرانے دَور کو پھر زندہ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے 'مگر 1990ء کی دہائی کے بعد گلوکاروں کا اپنی سی۔ ڈی یا DAT (فیتہ) کے استعمال سے اصل (LIVE) گانے کو بہت نقصان پہنچا۔ مشرقی سازوں کی مصنوعی آوازیں 'مغربی ساز نکالنے لگے۔ موسیقی سُننے ' کو ' موسیقی دیکھنے ، میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ اس قسم کی موسیقی 'کو کاروباری تقاضوں کے تحت میڈیا میں ترجیح دی جاتی ہے۔ وہ بھولے ہوئے ہیں کہہ پوری دنیا کے مہذب ممالک اپنے کاروباری منافع کا ایک خاطر خواہ حصہ ، اپنے وَرثے کو سمیٹنے اور زندہ رکھنے میں صَرف کرتے ہیں۔ اِس میں موسیقی کی کلاسیکل۔ نیم کلاسیکل اصناف اور لوک سنگیت سرِ فہرست ہوتے ہیں۔ 1960ء اور 1970ء کی دہائیوں جب مَیں مغرب میں قیام پذیر تھا تو اُنکے تشریاتی ادارے بی بی سی کے پاپ شو ' ٹاپ آف دی پاپ ' کے متعلق یہ کہا جاتا تھا کہہ ایک پاپ گانے کی زندگی زیادہ سے زیادہ سات سے تیس دن ہوتی ہے۔ یہی حال اب یہاں دیکھا جارہا ہے کہہ 1990ء سے 2000ء کی دہائیوں کے پاپ گروپس اب غائب ہو گئے ہیں۔ ہماری ریگولیٹری اتھارٹی نے سب ٹیلی ویژن کو یہ ہدایت نہیں دیں کہ وہ اپنے نشریاتی وقت کا کچھ حصہ اپنی روایتی موسیقی کی ترویج میں صرف کریں۔ جس سے تفریح و تعلیم ، دونوں مقاصد حاصل کیئے جاسکتے ہیں۔

ماضی قریب میں عمران - قادری دھرنے 'شمالی وزیرستان کے آپریشن اور مہاجروں کی بحالی کے کاموں پر حاوی نظر آتے رہے۔ ذکر چلا ہے موسیقی کا تو ہماری عیدوں 'جشنِ آزادی اور قومی دنوں پر ایسے سٹیج شوز کا انعقاد ہوتا ہے' کہ ناظرین موسیقی کی تال پر رقص کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ اِسی ضمنی بحث کا مقصد صرف یہ ہے کہ روایتی اور جدید موسیقی میں توازن برقرار رکھا جائے۔ محافلِ غزل کے انعقاد کا سلسلہ بحال کیا جانا چاہیے کہ فریدہ خانم جیسی کہنہ مشق اور سُریلی مُغنیہ صدیوں ہی میں پیدا ہوتی ہیں۔ تمام

ٹی وی چینلز بالخصوص پی ٹی وی پر ایسی محافل کے انعقاد سے نوجوان نسل میں غزل گائیکی سمجھنے اور گانے کا شعور بیدار ہوگا۔

موسیقی کی تعلیم:

اگر ہم فریدہ خانم کی ہی مثال لیں تو واضح ہو جاتا ہے کہ موسیقی کی روزانہ ریاضت اور مشق سے ہی کلاسیکل اور نیم کلاسیکل اصناف میں فنکار جنم لے سکتے ہیں۔ فریدہ خانم نے کلاسیکل موسیقی میں پٹیالہ گھرانے کے استاد عاشق علی خاں سے اسرار و رموز سیکھے۔ اس کے علاوہ اپنی ہمشیرہ مختار بیگم جو بھی استاد عاشق علی خاں کی شاگرد تھیں' کو ریاضت کرتے دیکھنے سے فریدہ خانم نے کلاسیکل موسیقی بالعموم اور غزل گائیکی بالخصوص پر دسترس حاصل کی۔ اگرچہ فریدہ خانم بحیثیت غزل گائیکہ کے شہرت یافتہ ہیں لیکن عوامی مقبولیت انہیں گیت اور لوک نغمے ادا کر کے بھی حاصل ہوئی۔ غزل گانے کے لیئے خوبصورت آلاپ اور پھر استھائی کو روایتی انداز میں ادا کرنا فریدہ خانم کا خاصا ہے خواہ وہ غزل 'نہ روا کہیے کارہی ہوں یا 'شامِ فراق اب نہ پوچھ پاکستانی فلموں کے لیئے انہوں نے کلاسیکل موسیقی کے فروغ کیلئے موسیقار سلیم اقبال کے لیئے مادام نور جہاں کے ہمراہ گیت 'سجن لاگی توری لگن من ما بھی گایا ہے۔ اپنے ریڈیو کے ایف۔ ایم۔ شوز کے لیئے جب میں نے فریدہ جی کے گانوں کی کھوج لگائی تو ایک اور خوبصورت نیم کلاسیکل مُجرائی انداز کا گیت 'تو آئیوں تے پَرت کے آ گئی میری سماعت سے گزرا جو کہ انہوں نے موسیقار سلیم اقبال کے لیئے فلم 'دکھ بجناں وے' کیلئے پیش کیا تھا!

اندازِ گائیکی:

جہاں تک فریدہ خانم کے گانے کے انداز کا تعلق ہے وہ طبلے والے کو ترغیب دیتی ہیں کہ وہ اُن کی گائیکی کے ساتھ ملے۔ گائیکی کے لوازمات یعنی کہ سُر اور لئے پر چونکہ انہیں مکمل دسترس ہے اس لیئے وہ لئے کے ایک مکمل دائرے کے آخر میں 'سم' پر گائیکی کا ملاپ کرنے کی ماہر ہیں۔ اس دوران اگر کبھی کبھار 'ایک آدھا 'سم' گزر بھی جائے تو کوئی مضائقہ نہیں! اُن کو اللہ تعالیٰ نے اور انکی اپنی ریاضت نے روشن 'جھومتی اور جھولتی ہوئی گلے کی باریکیوں سے نوازا ہے جس سے وہ آمد اور آورد دونوں کا کام لیتی ہیں! انہوں نے مجھے اپنی بیشتر ملاقاتوں میں یہ باور کیا ہے کہ یہ ان کا فرض ہے کہ وہ موجودہ نسل میں اپنی اس گائیکی کا پرچار کریں۔ ان کی خواہش ہے کہ غزل کو بھی جدید وڈیو بنانے کے انداز سے سنوار کر ٹی وی چینلز پر دکھا کر جاذب اور دلچسپ بنانا چاہیے۔ ایسا کرنے سے مشرقی موسیقی 'خاص طور سے غزل گائیکی بھی ہر دلعزیز ہو سکتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ فریدہ خانم نئی غزل کے ساتھ ان کی موسیقی کو بھی ان کا ہاتھ تھام کر ان کے ساتھ چلنے کو تیار ہیں۔ انکساری فریدہ خانم کی شخصیت کا ایک نمایاں پہلو ہے!

فریدہ خانم نے اپنی زندگی اپنے انداز سے گزاری ہے۔ 1960ء اور 1970ء کی دہائیوں میں ان کو بڑی گاڑیاں چلانے کا جنون تھا اور وہ انہیں تیز چلا کر ریڈیو پاکستان جایا کرتی تھیں۔ اُن دنوں سڑکوں پر ٹریفک بھی کم ہوا کرتی تھی۔ وہ اپنے پروڈیوسروں کیساتھ کام کرنے اور گفتگو کرنے میں آسانی پیدا کیئے رکھتی ہیں۔ ماسوائے دُھن کے انتخاب کے وہ روزمرہ کے معمولات میں قطعی مشکل پسند نہیں ہیں۔ اُن کا پسندیدہ لباس 'ساری ہے اگرچہ یہ لباس آجکل زیادہ تن زیب نہیں کیا جاتا ہے۔ ان کا ساری کے پلو سے بار بار اپنے سینے اور کندھوں کو ڈھانپنے کا انداز شائقینِ موسیقی میں بہت موسیقی پسند کیا جاتا رہا ہے۔ 1965ء کی جنگ کے دوران تمام فنکار 'بغیر کسی معاوضے کے ریڈیو پاکستان جایا کرتے تھے اور سر جوڑ کر بہترین ملی نغمے تخلیق کیا کرتے تھے۔ مَیں بھی گورنمنٹ کالج۔ لاہور سے وہاں جایا کرتے تھے۔ اُس دَور میں صوفی غلام مصطفےٰ تبسم اور موسیقار حسن لطیف للعت نے ایک بہترین غزل 'وہ مجھ سے ہوئے ہمکلام اللہ اللہ' تخلیق کی۔ راگ ایمن کی اِس بندش کو فریدہ خانم نے ادا کر کے لازوال بنا دیا۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ بحث چھڑ گئی تھی کہ غزل کے مکھڑے کے کس حصہ میں 'سَم' باندھا جائے۔ بندہ یہ خواہش ہی کر سکتا ہے کہ تخلیق کار پھر اُسی طرح مِل بیٹھا کریں۔ وہی اجتماعی روّیہ پھر سے جنم لے اور پھر سے ایسی تخلیقات جنم لیں۔ کلاسیکل موسیقی اور غزل گائیکی کے متعلق فریدہ خانم کا موقف بالکل واضح ہے۔ وہ کہتی ہیں "اس وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ نہ صرف نیا خون اِن اصناف کی طرف رغبت کرے اور ان کو فراوانی سے تعلیم دی جائے تا کہ وہ ان اصناف کو عزت کی نظر سے دیکھیں۔ ورنہ یہ اصناف 'دائرہ موسیقی سے جلد ہی خارج ہو جائیں گی"۔

دلچسپ واقعات:

فریدہ خانم کے فنی سفر سے متعلقہ متعدد دلچسپ واقعات منسلک ہیں۔ آج سے ایک دہائی پیشتر مَیں نئے (فریدہ جی کیلئے) موسیقار 'ضمیر احمد خاں کو ان کے ہاں لے گیا۔ انہوں نے میرزا غالب کے کلام کی بنائی گئی 'اپنی دُھنیں سنائیں۔ فریدہ جی اتنی جذباتی ہو گئیں (دھنیں پسند کر کے) کہ وہ کئی گھنٹے 'ہارمونیم کے پاس 'زمین پر بیٹھ کر اِن دھنوں کو

گنگناتی رہیں۔ فریدہ خانم کو اِن دھنوں میں راجستھان کی موسیقی کی خوشبو پسند آئی چونکہ ضمیر صاحب کا تعلق راجستھان سے ہے۔اور اُس رنگ سے جُداگانہ ہے جو کہ پنجاب سے تعلق رکھنے والے موسیقار ان کے سامنے پیش کرتے رہے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہہ بشرطِ زندگی ضمیر صاحب کی لاہور دوبارہ آمد پر ہم فریدہ جی! کو ان دھنوں کو ریکارڈ کرنے کے لیئے آمادہ کر لیں کیونکہ ضمیر صاحب دودھ اور بخور کی تجارت کے باعث اپنا زیادہ وقت کراچی اور سعودی عرب میں گزارتے ہیں۔ایک اور کہانی جو ریڈیو پاکستان کے برآمدوں میں گزرتے ہوئے سُنی وہ فریدہ خانم کے موسیقی کے ریاض کرنے کے متعلق ہے۔ ایک مرتبہ وہ ریاض کرتے غلطی کر بیٹھیں تو ان کے استاد نے غصہ میں آکر اُگالدان ان کو مارا جسکی وجہ سے ان کے ماتھے پر اب بھی زخم کا نشان موجود ہے یہ حالات تھے اُس دور کے سختی سے ریاض کرانے کے۔اب وہ دور کہاں!

شخصیت کے روشن پہلو اور غزل گائیکی:

فریدہ خانم ایک اچھی دوست ہیں۔انہیں یہ کہتے سُنا گیا ہے۔ دوستی بغیر کسی بندھن کے زیادہ دیرپا ہوتی ہے۔ وہ اپنے اپنے دوستوں سے دوستی نبھائے چلی جاتی ہیں۔وہ ریڈیو پاکستان لاہور میں جانا زیادہ پسند کرتی ہیں خواہ ریکارڈنگ کرونے یا کسی مقابلۂ موسیقی کی مصنف کی حیثیت میں یا ریڈیو پاکستان کے ملازمین کو ایوارڈ دینے کے چناؤ کیلئے! اگر شخصیت کو کم لفظوں میں بیان کیا جائے تو "فریدہ خانم ایک اعلیٰ تربیت یافتہ شخصیت ہیں اور اُس سے بڑھ کر اعلیٰ درجہ کی فنکارہ ہیں فریدہ خانم کو یہ بھی کہتے سُنا گیا ہے کہ وہ نئی نسل کے ساتھ مل کر کام کرنے کو تیار ہیں بشرطیکہ نمائندگانِ نئی نسل سُر اور لے میں ہوں۔ بھارت میں اُن کی موسیقی اور شخصیت کے ایک پرستار نے اک شخصیت اور فن کو کچھ اسطرح سمیٹا ہے: " اپنے چاہنے والوں کی کئی برسوں سے فریدہ خانم اپنی غزل اور ٹھمری گائیکی سے محفوظ کر رہی ہیں۔اِن اصناف کو یکساں مہارت سے گانا اور شاعری اور سُر میں جذبات کی موجودگی اُن کا خاصا ہے۔انہوں نے غزل گائیکی کو کلاسیکل موسیقی سے سنوارا ہے اور اِسی وجہ سے نہ صرف برِصغیر میں بلکہ پوری دنیا میں انہیں بے تاج ملکۂ غزل کہا جاتا ہے۔ اِسی وجہ سے بیرونِ ممالک بھی انہیں خطابات سے نوازا گیا جیسا کہ ہندوستان میں 'حافظ علی خاں ایوارڈ سے"!

فریدہ خانم نے بھارت میں بھی کئی مرتبہ اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ جہاں پر ان کے ہزاروں پرستاران کے منتظر رہتے ہیں۔ حالانکہ وہ خود بھی خواہش مند رہی ہیں کہ بھارت کے وہ زیادہ دَورے کرسکیں لیکن بعض اوقات دونوں ہمسایہ ممالک کے آپس کے تناؤ کیوجہ سے وہ اپنی خواہش کو عملی جامہ نہ پہنا سکیں لیکن جب بھی حالات بہتر ہوئے وہ بھارت گئیں اور اپنے پرستاروں کو اپنی گائیکی سے خوش کرتی رہی ہیں۔ انہوں نے اپنے ایک ایسے دورے پر بھارت کے میڈیا کو کہا "مجھے بھارت چند مرتبہ آنے کا موقع ملا۔ ایک مرتبہ پاک۔انڈیا فورم کی دعوت پر اور پھر ایک انڈین آرگنائزیشن SPIC کی دعوت پر"۔مندرجہ بالا سطور میں ذکر کیا گیا ہے کہ اُنہیں حافظ علی خاں ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ یہ ایوارڈ اُنہیں دسمبر 2005ء میں ملا۔اُن کی اِس بھارت یاترا کے متعلق میڈیا میں رپورٹ چھپی جس کے اِقتباسات ذیل درج ہیں: "اپنے جسم اور گفتگو میں انکساری کا جھکاؤ اور آنکھوں میں مسلسل چمک وضع داری اور خود اعتمادی فریدہ خانم کے پرستاروں کے دل جیت لینے کیلئے کافی ہیں۔ ہلکے چنبیلی رنگ کی ساری میں ملبوس جس کی مناسبت اُن کی گلابی رنگت کے ساتھ مطابقت رکھتی ہے فریدہ خانم کی غزل گائیکی کی محافل کی کامیابی کی ضامن ہیں۔ جب وہ اپنی فراخدل مُسکراہٹ اور گرم جوشی سے اپنے پرستاروں سے ملتی ہیں تو وہ ان کے مُعترف ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔اگر ان سے ایک مرتبہ ملاقات ہوجائے تو اِس امر کا احساس ہوجاتا ہے کہ مادام فریدہ خانم پر قسم کے تصنع اور جذباتی وابستگی سے مبرّا ہیں"

فریدہ دوسری پاکستانی فنکارہ ہیں جن کو حافظ علی خاں ایوارڈ (2005ء) دیا گیا تھا۔اس پیشتر استاد نصرت فتح علی خاں 1996ء میں اِس شہرت یافتہ ایوارڈ کے حقدار ٹھہرے تھے۔فریدہ خانم کو اس ایوارڈ کے نوازنے کے موقع پر مندرجہ ذیل الفاظ سے خراج پیش کیا گیا تھا۔ "اگر دنیائے موسیقی میں غزل گائیکی کا تاج پہنانے کیلئے کسی بشر کو تلاش کیا جائے تو یہ صرف اور صرف پاکستانی غزل گائیکہ فریدہ خانم ہی ہیں"۔ یہ ایوارڈ اُستاد حافظ علی خاں کے نام سے منسوب ہے جو دنیائے موسیقی میں ساز سرود بجانے کے استاد تھے۔ یہ ساز ایک تنگ گلے کا بربط ہے جسکو بجانے کی تعلیم میاں تان سین کی لڑی سینیا گھرانے سے حاصل کی گئی۔گوالیار کے دربار میں یہ ساز بجایا جاتا تھا۔جب فریدہ خانم وطن واپس پہنچیں تو انہوں نے گِلہ کیا کہ ماسوائے ایک نجی ٹیلی ویژن چینل کے بقیہ تمام نشریاتی اداروں نے اس خبر کو نظر انداز کیا تھا۔انہوں نے سوال کیا "ایسا کیوں کہ اگر ہمارا کوئی فنکار بھارت میں نوازا جاتا ہے تو پھر ہی ہم اس کو اپنے وطن میں کیوں نہیں پہچان پاتے ہیں! انہوں نے بات بڑھاتے ہوئے فرمایا! " ہم کلاسیکل اور غزل موسیقی کو ترجیح دینے میں کامیاب

نہیں ہو سکے ہیں کیونکہ اس فن پہ دسترس حاصل کرنے کیلئے مسلسل جدو جہد اور ریاضت درکار ہے۔ اس مقصد کا حصول صرف اور صرف ہمارے ثقافتی اداروں میں موسیقی سے متعلقہ افراد کی سربراہی ہی میں ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ بھارت میں ادارہ 'سرود گھر' ہے۔ پاکستان میں کلاسیکل موسیقی کو وہ عزت نہیں ملتی ہے جتنی کہ بھارت میں۔ اس کے علاوہ ہندوستانی پرستار اور صاحب اقتدار شخصیات ہمارے جیسے فنکاروں کو بہت عزت بخشتے ہیں"۔

مشہور نغمے:

یہ میری خوش بختی ہے کہ میں نے فریدہ خانم کی ریڈیو پاکستان اور پاکستان ٹیلی ویژن کیلئے کافی ریکارڈنگ ہوتے ہوئے دیکھی ہیں۔ اس لیئے میں ان کے مشہور نغموں کا ذکر بآسانی کر سکتا ہوں۔ شائقینِ موسیقی کی ذہن میں یہ ضرور بات ہو گی کہ وہ زندہ گانے؟(Live Singing) میں اپنی بہترین کارکردگی دکھاتی ہے۔ اپنے گانے کو زیادہ تر آلاپ سے شروع کر کے اُس نغمے کی دُھن کے ماحول کو اُجاگر کرتی ہیں۔ اگر آپ ان کی گائیکی کا انداز پرکھنا چاہیں تو جاوید قریشی کی مشہورِ زمانہ غزل 'دل جلانے کی بات کرتے ہو' کو سُن لیجئے۔ یہی سلوک انہوں نے میرزا غالب کی غزل 'ابنِ مریم ہُوا کرے کوئی' اور ناصر کاظمی کی غزل 'دیارِ دل کی رات میں چراغ سا جلایا گیا' کو دیا ہے۔ اِس ضمن میں مندرجہ ذیل غزلوں کا تذکرہ کیا جا سکتا ہے۔

وہ مجھ سے ہوئے ہمکلام اللہ اللہ (شاعر: صوفی غلام مصطفےٰ تبسم)

دلِ مُضطر کو سمجھایا بہت ہے (خوبصورت ادائیگی)

مگر اس دل نے تڑپایا بہت ہے

چاند نکلے کسی جانب تیری زیبائی کا

رنگ بدلے کسی صورت شبِ تنہائی کا

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے

وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے (شاعر: فیض احمد فیض)

(اگرچہ طلعت محمود نے بھی اس شاعری کو باکمال سُروں میں باندھا ہے لیکن فریدہ خانم کی ادائیگی بھی آسان اور جذباتی ادائیگی ہے)

ہے یہاں نام عشق کا لینا (یہ غزل ریڈیو پاکستان پر بہت مقبول ہے۔ سامعین میں بھی اور اربابِ اختیار میں بھی! اس غزل کی ادائیگی سے فریدہ خانم کی کلاسیکل موسیقی پر دسترس کا اندازہ ہو جاتا ہے)

ہم بھی کیا زندگی گزار گئے

اِس طرح قِصّہ میرا

جب اُس زلف کی بات چلی

ڈھلتے ڈھلتے رات ڈھلی (مہدی حسن کی آواز میں بھی یہ غزل مقبول ہے)

جس طرح چاہے کرم

کچھ اور کم رہے

کیا ہوا جو ستارے

میرے ہم نفس میرے ہمنوا

ناروا کہیے (ادائیگی کے اعتبار سے بہترین (master piece))

محبتوں کے یہ

پھول برساتا ہوا

دیکھیں گے

سازِ یہ کینہ

سب قتل ہو کے تیرے مقابل سے آئے ہیں

شامِ فراق اب نہ پوچھ آئی اور آ کے ٹل گئی (شاعر: فیض)

سُوئے میکدہ

توبہ توبہ میری توبہ

تیرے آنے کا دھوکا سا رہا ہے

دیا سا رات بھر جلتا رہا ہے (شاعر: ناصر کاظمی)

طوفاں بادل ہے کوئی

تم آئے ہو نہ شبِ انتظار گزری ہے

تلاش میں سحر بار بار گزری ہے (شاعر: فیض) (یہ غزل نور جہاں اور مَیں نے بھی کسی اور دُھن میں ادا کی ہے)

تم لاکھ مجھ سے پردہ

تمہاری انجمن سے اُٹھ کے

عذر آنے میں بھی ہے اور بُلاتے بھی نہیں (باکمال ادائیگی)

یُوں سجا چاند کہ چھلکائے تیرے انداز کا رنگ وغیرہ

چند نغمے ایسے ہوتے ہیں جن کو سٹوڈیو میں باقاعدہ موسیقی کے ٹریک کے ساتھ گلوکار سے ادا کروایا جاتا ہے اور بعد میں سازوں اور آواز کو صوتی اعتبار سے یا پھر کمپیوٹر کی سوئیوں کے ذریعہ اکٹھا کیا جاتا ہے۔ یہ LIVE ریکارڈنگز نہیں ہوتیں۔ فریدہ خانم نے بھی اس انداز سے بہت نغمے ریکارڈ کروائے ہیں۔ جن میں میری پسندیدہ غزل 'آفت کی شوخیاں تمہاری نگاہ میں/ محشر کہ کتنے کھلتے ہیں جلوہ گاہ میں' سرِ فہرست ہے۔ اس غزل میں لفظ 'آفت' کو مختلف انداز میں ایک سے زیادہ بار کہا گیا ہے جو ادائیگی میں موسیقیت کو وسیع کرتی ہے۔ اس نوعیت کی ایک اور غزل ہے 'دیر لگی آنے میں تم کو شکر ہے پھر بھی آئے تو/ آس نے دل کا ساتھ نہ چھوڑا ویسے ہم گھبرائے تو'! فریدہ خانم ہر صنف کا نغمہ یکساں مہارت سے گاتی ہیں۔ اِن کی ٹھمریاں اردو گیت اور پنجابی لوک گیت بھی بہت پسند کیئے گئے ہیں۔ جیسا کہ

لادے جھمکا چاندی کا

مَیں نے پیروں میں پائل تو باندھی نہیں
سوہنی دھرتی اللہ رکھے قدم قدم آباد (وطن کا گیت)
بلّے بلّے ٹور پنجاب دی
تیرے باجرے دی راکھی
لٹھے دی چادر اُتے سلیٹی رنگ ماہیا (پنجابی لوک نغمہ)
وغیرہ

فریدہ خانم کو کلاسیکل راگ بھی 'خیال' کی گائیکی میں گانے پہ دسترس حاصل ہے۔ اُن کے پسندیدہ راگوں میں راگ بھاگیشری کی ادائیگی تکنیکی اور جمالیاتی پہلوؤں سے بہت عمدہ ہے۔ اتنی جدوجہد اتنی ریاضت اور ماشاء اللہ کامیابی! جیسا کہ انگریزی زبان کا مقولہ ہے!

The rest is history!

فریدہ خانم اپنے پرستاروں کے لیئے نہ صرف اردو زبان میں بلکہ کبھی کبھار فارسی زبان میں غزلیں گاتی رہتی ہیں۔ پنجابی اور پشتو زبان میں بھی جب وہ گیت 'آج جانے کی ضد نہ کرو' گاتی ہیں یا اطہر نفیس کی غزل 'وہ عشق جو ہم سے روٹھ گیا' یا میرزا غالب کی غزل 'مدت ہوئی یار کو مہماں کیئے ہوئے' گاتی ہیں تو سامعین پر طلسم کر دیتی ہیں اور بہت دیر تک ان کے پرستار ایک جادوئی کیفیت میں سرشار رہتے ہیں۔ فریدہ خانم کی شاعری کا انتخاب بہت معیاری کیا ہے 'چاہے وہ اساتذہ کی شاعری ہو جدید شعراً اکرام کی! ان کی غالب 'فیض 'داغ دہلوی' آغا حشر کاشمیری اور غلام مصطفےٰ تبسم کی غزلیں بہت پسند کی گئی ہیں۔ اپنی کائل یاترا کے متعلق اکثر ذکر کیا کرتی تھیں کہ فارسی زبان کی غزلوں کی اتنی بار ریہرسلز کرتی تھیں کہ انہیں محسوس ہوا کہ وہ فارسی زبان میں گفتگو کرنے کے قریب تھیں!

ماضی قریب کی ایک دلفریب غزل نائٹ:

فریدہ خانم اسٹیج پر گانا بہت پسند کرتی ہیں۔ صحافیوں نے اُنکے ماضی قریب کی ایک ایسی یادگار اسٹیج محفل کا ذکر ان الفاظ میں کیا جو 4، نومبر 2013ء کو منعقد ہوئی تھی۔ 'جب وہ فریدہ خانم آہستہ آہستہ اسٹیج پر نمودار ہوئیں تو ایک لمحے کے لیئے ایسا محسوس ہوا کہ وہ نقاہت کا شکار ہیں پر جونہی وہ اپنے پرستاروں سے مخاطب ہوئیں تو وہ بالکل مختلف شخصیت اختیار کر گئیں: پُر اعتماد اور مکمل کنٹرول! یہ الحمراء لاہور میں آرٹ اور لٹریچر تقریبات کا دوسرا دن تھا۔ یہ دن فریدہ خانم کے نام مسنون کیا گیا تھا۔ اِس نشست کا عنوان تھا 'The Love song of Pakistan' (پاکستان کا محبت کا نغمہ)۔ میزبان علی سیٹھی تھے۔ شاید ان تقریبات کی یہ سب سے کامیاب نشست تھی جس میں شائقینِ موسیقی اپنے محبوب فنکاروں کی گفتگو سُننا چاہتے تھے!

فریدہ خانم نے یہ بتایا کہ ان کو بچپن میں گانے سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا لیکن خوش قسمتی سے انہیں ایسے کہنہ مشق اساتذہ کی صحبت میسّر ہوئی جنہوں نے انتہائی محنت سے انہیں کلاسیکل موسیقی کے اسرار و رموز سے آشنا کیا۔ ریڈیو پاکستان پر زیڈ۔اے۔بخاری صاحب نے انہیں ہر قسم کی گائیکی پیش کرنے کے اَن گنت مواقع فراہم کیئے۔ ایک سوال پر کہ انہوں نے کلاسیکل راگوں کی گائیکی سے زیادہ غزل گائیکی کو کیوں ترجیح دی 'تو فرمایا کہ جب انہوں نے پیشہ ورانہ گائیکی کا آغاز کیا تو ملکۂ موسیقی روشن آرا بیگم اپنے عروج پر تھیں اور اُن کا مقابلہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ مزید برآنکہ کلاسیکل گائیکی بہت محنت طلب کام تھا۔ فریدہ خانم نے راگوں کی پیچیدگیوں کا ذکر کیا اور خصوصاً ذکر کیا کہ ان کی گائی گئی کافی غزلوں کی بندش راگ ایمن میں کی گئی تھی جیسا کہ 'شامِ فراق اب نہ پوچھ آئی اور آ کے ٹل گئی'! فریدہ خانم کے موقف کو آگے بڑھاتے ہوئے 'غلام علی نے کہا راگ ایمن اور راگ بھیرویں میں دنیا بھر کی دُھنیں ترتیب دی گئی ہیں۔ پھر انہوں نے دونوں راگوں کی ساخت پر گفتگو کی اور آگاہ کیا کہ راگ ایمن حضرت امیر خسرو کی اِختراع تھی۔ انہوں نے اس راگ کی ایک بندش ادا کی۔

انہوں نے کہا کہ ایک اچھے گائیک کے پاس خُدا داد گانے کی صلاحیت ہونی چاہیئے جسکو ریاضت سے پختگی مل سکتی ہے۔ غلام علی۔ نے ریاضت کرنے پر زور دیا اور کہا کہ وہ خوش قسمت تھے کہ انہیں دیانت دار اساتذہ میّسر آئے اور انہوں نے الفاظ کے تلفظ درست رکھنے کے لیئے بھی نامور شعراً اکرام اور اردو ادب سے رجوع کرنے میں کوئی عار نہیں سمجھی۔ غلام علی نے حاضرین کے تجسّس کی اس علم سے آبیاری کی کہ اُن کی گائی ہوئی ناصر کاظمی کی مشہور غزل 'دل میں اِک لہر کی دُھن۔ ریڈیو۔ ٹی وی۔ کے موسیقار الطاف حسین نے ترتیب دی تھی۔ فریدہ خانم نے ریشماں' جن کا حال ہی میں "انتقال ہوا تھا' کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے 'ان کا گیت 'ہائے اور رباّ میں لگدا دل میرا 'گا کر حاضرین سے داد حاصل اور کہا کہ ریشماں کا انداز 'خود ریشماں ہی نبھا سکتی تھیں۔ وہ اپنے دل سے گاتی تھیں۔ فریدہ خانم نے کہا کہ وہ اپنے گھر میں ریشماں کے اگانے اکثر گنگنایا کرتی تھیں۔ یہ حِصّہ اُس نشست کا بہترین پہلو تھا حالانکہ علی سیٹھی نے غزل اور خیال گائیکی کی تاریخ بیان کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی اور دونوں مہمان گائیکوں سے صرف ہاں ہوں میں تائید حاصل کرنے کی کوشش کی۔

مختصر کہانی

ٹی ہاؤس

اِرم ہاشمی

اُبھی اُبھی جو آدمی آیا ہے، وہ روز اس ٹی ہاؤس میں آتا ہے۔۔وہی جس کے پاس براؤن رنگ کا چرمی بیگ ہے۔۔۔

یہ ٹی ہاؤس ایگریکلچر بینک کے ملازمین کے لئے ہے، لیکن اِردگرد کے دفاتر میں کام کرنے والے ملازمین اور کاروباری لوگ بھی یہاں چائے پیتے نظر آتے ہیں، سہ پہر چار بجے ٹی ہاؤس میں چائے پینے والوں کا وہ ہجوم ہوتا ہے کہ کھوے سے کھوا چھلتا ہے، میں بھی روز یہاں دفتر سے فارغ ہو کر چائے پینے آتی ہوں شاید اِسی لئے مجھے یہاں بیٹھے سب لوگوں کی آنکھوں میں ہلکی پہچان نظر آتی ہے۔دائیں طرف کی ٹیبل پر بیٹھے نوید صاحب کی نوکری صاحب بہادر کی ناراضگی کی وجہ سے چھٹ چکی ہے، ان کے ساتھ موجود ظفیر احمد کی یونیورسٹی اور منیب احمد کا آفس بند ہے، شاذب صاحب ابھی ابھی ڈاکٹری کے امتحان میں فیل ہو کر نکلے ہیں، سب کے ہاتھ میں چائے کی پیالی نظر آتی۔

دِن بھر کام کرنے کے بعد اکثر یہاں مضطرب اور تھکے ہارے چہرے نظر آتے ہیں۔اِس وقت جب کہ شام کا ملگجی اُجالا کھڑکی سے آہستہ آہستہ ٹی ہاؤس کے فرش پر اُتر رہا ہے۔باہر خوشنما بادلوں کی ٹکڑیاں اور درخت جھوم رہے ہیں، ہواؤں میں ایسی بھینی بھینی خوشبو بسی ہے جو مست کئے ڈالتی ہے، کائنات پر وہ سکوت طاری ہے جو عموماً کسی پُرشور ہنگامے کے بعد پیدا ہو جاتا ہے، ٹیپ ریکارڈر کی مدھم آواز ماحول کو پُرکیف بنا رہی ہے، کولیگز اور نوجوان جوڑے اَپنی سیٹوں پر بیٹھے چائے پی رہے ہیں۔کوئی اَخبار پڑھ رہا ہے، کوئی سگریٹ کے کش لگا رہا ہے، میرے سامنے کی ٹیبل پر بیٹھے ایک صاحب جو وضع قطع سے تعلیم یافتہ اور جہاندیدہ معلوم ہو رہے ہیں، بہت دیر سے مذہب، تہذیب، سیاست، اُصول پسندی اور اِخلاقیات پر اَپنے ساتھی کے ساتھ محوِ گفتگو ہیں، ملک میں موجود غربت اور نوجوان طبقہ ان کا خاص ہدف ہے، وہ اپنے سامنے بیٹھے ایک نوجوان سے مخاطب ہیں ''ہمارے نوجوان کام کرنا ہی نہیں چاہتے اور راتوں رات کروڑ پتی بننے کے خواب دیکھتے ہیں، اگر ملک میں موجود غربت کی ذمہ دار سرکار ہے تو عوام بھی کم نہیں''۔اِردگرد کی میزوں پر بیٹھے اکثر لوگ ان کی طرف متوجہ ہیں، اُن کی بلند آواز ٹی ہاؤس میں گونج رہی ہے، میں بھی ان کی باتیں غور سے سن رہی ہوں، گو کہ میری نظریں اپنی ٹیبل پر ہیں اور میں چائے کے انتظار میں ہوں۔

وہ ۔۔۔ وہی براؤن رنگ کے چرمی بیگ والا آدمی۔۔۔ کھڑکی کے ساتھ والی ٹیبل پر بیٹھ گیا ہے۔اُس کے پورے وجود میں جو چیز غالب ہے، وہ اُس کی مہک ہے۔اُس کے چہرے پر فکر کی اَن گنت آڑھی ترچھی لکیروں کا جال بُنا ہے۔اُس نے حسبِ معمول بے زاری کے ساتھ کندھے سے براؤن رنگ کا چرمی فائل بیگ اُتار کر میز پر رکھا۔سامنے کی میزوں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور اَپنی دونوں بانہوں کو اُٹھا کر سر کے پیچھے باندھ لیا ہے۔اگر آپ ٹی ہاؤس سے باہر نکل کر روڈ کراس کریں تو دفاتر کے درمیان آرٹ گیلری کی بلڈنگ نظر آئے گی، یہ یہاں منیجر ہے۔

اس شخص کی موجودگی کا احساس صرف مجھے ہے، میں اُسے نہ دیکھتے ہوئے بھی دیکھ رہی ہوں۔۔۔ یہ آپ مجھے گھور کیوں رہے ہیں!! میں یہاں کسی کے لئے نہیں آتی، میں صرف چائے پینے آتی ہوں۔۔۔ دِن ڈھل رہا ہے اور اِس کی پیلی روشنی ٹی ہاؤس کی دیواروں پر محسوس ہو رہی ہے، پھر شام ہو جائے گی، یوں لگتا ہے میرے اندر لفظوں کا شور ہے جو باہر آنے کے لئے راستہ تلاش کر رہا ہے، میں قنوطی نہیں ہوں لیکن کچھ دِنوں سے شام ہوتے ہی عجیب و غریب خیالات میں گھر جاتی ہوں، مجھے ڈر لگنے لگا ہے، راستہ بھول جانے کا ڈر۔۔۔

ٹی ہاؤس میں ہجوم بڑھنے لگا ہے، لوگ خوش گپیوں میں مصروف ہیں۔

وہ مجھے بار بار اِس طرح دیکھ رہا ہے جیسے میرا اُس سے بہت پرانا تعلق ہو، اُس کی آنکھیں میرے لئے عزت کا احساس لئے ہیں، لیکن مجھے مردوں پر ذرا بھی اعتبار نہیں، میں جانتی ہوں یہ جو مرد ہوتے ہیں یہ عورتوں کی قدر نہیں کرتے، اِنھیں دوسرے درجے کی مخلوق سمجھتے ہیں،

لیجئے! چائے آ گئی، آپ اِس سے لطف اندوز

ہوں اور میں بھی۔

داخلی دروازے کے ساتھ ٹیبل پر ایک لڑکا اور لڑکی اردگرد سے بے نیاز خود میں گم بیٹھے ہیں، ٹی ہاؤس کا مالک کئی بار ان کے پاس سے ہو کر چلا گیا ہے، کئی بار وہ ان کے پاس جا کر ٹھٹھکا، رکا اور گھبرا کر آگے کو بڑھ گیا، وہ دونوں پیار کی لافانی ساعتوں میں گم ہو کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہیں، مالک کو چائے کا بل وصول کرنے کی بھی ہمت نہ ہوئی۔

وہ آدمی دُرزیدہ نگاہوں سے مجھے ہی دیکھے جا رہا ہے، میں بھی اُس میں کچھ دلچسپی لے رہی ہوں، مجھے اِس سے انکار نہیں لیکن۔۔۔آپ خود سوچیں کہ کوئی مرد آپ کو بار بار دیکھے تو آپ کے اَندر کسی جذبے کا پیدا ہونا فطری بات ہے، میں نے گھبرا کے اِدھر اُدھر دیکھا، کہیں کوئی مجھے دیکھ تو نہیں رہا لیکن کسی کو فرصت نہیں تھی، میں نے شکر کی سانس لی، یہ وقت ہی ایسا ہے کہ سب کو اپنا اپنا کام نمٹا کر گھر جانے کی جلدی ہوتی ہے۔

پچھلے کئی سالوں میں ہونے والی تبدیلیوں نے اِس شہر کو ایک بڑے شہر کے درجے میں لا کھڑا کیا ہے، شاندار ہوٹل، روشنی میں نہائی مارکیٹ اور عالی شان عمارتوں کے باعث اِس شہر کا ایک خاص مقام ہے، سارے کلب اور ہوٹل اِسی حصے میں واقع ہیں، شہر کے منچلے اور دولت مند لوگ اپنی شامیں گزارنے یہاں آتے ہیں، ماڈرن قسم کی لڑکیاں اِس بدلے ہوئے شہر کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے بھٹکتی پھرتی ہیں۔اِس ٹی ہاؤس کے کاؤنٹر پر بھی آپ کو کئی نوجوان لڑکیاں نظر آئیں گی۔

ٹی ہاؤس میں اور بھی بہت سے لوگ ہیں لیکن۔۔۔ وہ صرف مجھے ہی دیکھتا ہے، اِس کا مطلب ہے مجھ میں ضرور کوئی خاص بات ہے۔۔۔شاید میں اُس کو پسند آ گئی ہوں، میں ضرورت سے زیادہ ہی جذباتی ہو رہی ہوں۔۔۔زندگی مختصر سہی مگر۔۔۔عمر باقی ہے۔30 سال۔۔نہیں جناب!اسی ماہ چالیس سال میں داخل ہو چکی ہوں۔کیا کہہ رہے ہیں آپ!!!!شادی کر لوں۔۔۔؟ آپ مذاق تو نہیں کر رہے۔میں ایک عام سی انسان ہوں اور اردگرد کے حالات سے جلد متاثر ہو جاتی ہوں لیکن مجھے موجودہ حالات میں محبت کے اِس اُٹھتے طوفان کا رُخ بدلنا ہوگا، مجھے اِسے روکنا ہوگا، اِس معاشرے میں چالیس سال کی عمر میں مجھے محبت کرنے کا کوئی حق نہیں۔

میرے بالوں میں آپ جو گلاب کا پھول دیکھ رہے ہیں، یہ یہاں آنے سے پہلے بینک کے کوریڈور کے ایک گملے سے توڑ کر لگایا ہے، اِس کی مہک مدہوش کئے دیتی ہے۔۔۔جی!!!آپ کے کہنے کا مطلب ہے، مجھے اس عمر میں یہ حرکتیں زیب نہیں دیتیں، میں جانتی ہوں، آپ یہ ضرور کہیں گے، اس عمر میں ایسے سوال قدم قدم پر سر اٹھاتے ہیں لیکن میں خود بھی نہیں جانتی کہ میں نے بالوں میں گلاب کا پھول کیوں لگایا ہے، میں کیوں سنورنے لگی ہوں!! لیکن میرا خیال ہے یہ سب باتیں بے معنی ہیں، شوق کی کوئی عمر نہیں ہوتی۔

میں نے ایک عمر تنہا گزاری ہے لیکن اَب کچھ دنوں سے رات ہوتے ہی ایک ہیولا ملنے چلا آتا ہے، جیسے کوئی پرچھائیں ہے جو دَبے پاؤں میرے پیچھے پیچھے چلتی ہے، مجھ سے سرگوشیاں کرتی ہے، آپ غلط سمجھ رہے ہیں، میں تنہائی سے نہیں ڈرتی۔۔۔میں بھوت پریت سے بھی نہیں ڈرتی۔۔۔شاید خود سے ڈرتی ہوں، نہ جانے زندگی کیوں اتنی ڈراؤنی ہوتی جاتی ہے۔

آپ، مجھے اِتنا گھور کیوں رہے ہیں!!!ایسا لگتا ہے اُس کے بار بار دیکھنے سے آپ کو بھی جلن ہو رہی ہے۔میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ اُس کی مہک اور مسکراتی آنکھوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔۔۔آپ ٹھیک کہتے ہیں، میں وصلِ یار کے تصور میں اتنا کھوئی ہوں کہ ہوش و خرد سے بیگانہ ہوں، لیکن۔۔۔ہم اِس بارے میں خاموش رہیں تو بہتر ہے کیونکہ میں اپنی عمر کی چوتھی دہائی میں ہوں۔

دھیرے دھیرے شام ڈھلنے لگی ہے، پرندے شور کرتے ہوئے اپنے آشیانوں کو لوٹ رہے ہیں، ہلکی ہلکی ہواؤں میں یکا یک تیزی آ گئی ہے اور ہوا کے تیز جھونکے کھڑکیوں پر لگے پردوں کو اُڑا رہے ہیں۔ٹی ہاؤس کی زیادہ تر کرسیاں خالی ہو چکی ہیں، کاؤنٹر کا رش بھی کم ہو گیا ہے، مجھے بھی اب گھر چلنا چاہئے، لیکن ذرا رُکئے، میں اپنی بے ترتیب ہوتی دھڑکنوں کو متوازن کر لوں۔مجھے اُس کے پاس سے گزر کے جانا

ہے اور وہ چائے کی چسکی لیتے ہوئے میری طرف دیکھ رہا ہے۔۔ہاں ٹھیک ہے۔۔۔تو چلئے پھر۔۔۔!!

جب تم میری آنکھیں پڑھتے ہو

تم میری آنکھیں کیسے پڑھ پاؤ گے
جن کی تہہ دار کیفیتوں کے کئی شیڈز ہیں
جو کبھی نہ آپائے تمہاری دسترس میں
یہ آنکھیں جو بولتی ہیں
وہ ناقابل بیان ہے تمہارے لیے
مگر تمہارا دل جانتا ہے
جو ایک بے نام محبت کے سوز سے لبریز ہے
میری آنکھیں جب تمہارے پیکر خیال کو دیکھتی ہیں
جو تم نے اپنی سٹڈی والی دیوار پر خاص طور سے
یوں آویزاں کر رکھا ہے
جیسے وہ پیکر خیال تمہارے سینے کے خلا کو بھرنے کے
لیے کافی نہ ہو
میری آنکھوں کی پتلیوں میں..... آنکھیں ڈال کر
مسلسل دیکھنے سے
ایک برفیلی سی لہر تمہارے شاہانہ انداز کے
اونچے کالر والے کوٹ
اور برف کے ریزوں سے ڈھکے ہوئے
کاندھوں کی بوجھل مچھلیوں میں سرایت کر رہی ہے
تمہاری آنکھوں کی خاموش گنگناہٹ
ایک بھولی بسری غزل کے بولوں کی طرح
ہم کلام ہے میری آنکھوں سے
جیسے پائیں باغ میں گنگناتی ہوئی ہلکی سرمئی رنگ کی فاختہ
دیہاتی تندور کے اردگرد بیٹھی
مسلسل باتیں کرتی عورتوں کی طرح
بولتی ہیں تمہاری آنکھیں
اس دن برگد کی چھاؤں میں بیٹھ کر
روایتی بولیاں گانے والی بوڑھی عورتوں کی آنکھوں میں
پھیلے ہوئے کاجل کے بالکل برعکس
ایک پراسرار کشش تھی
تمہاری بادامی آنکھوں میں
جیسے ایک پتھریلی خاموشی
جس میں محبت کی کوئی قدیم کہانی گونج رہی تھی
اور پھر پلٹ پلٹ کر واپس آنے والی
اس گونج کی دُھند
تمہاری عینک کے شیشوں پر جمتی جا رہی تھی
اور تم
ایک پتھر کی طرح منجمد ہوتے جا رہے تھے
تمہاری گردن سے لٹکی ہوئی چین کی لاکٹ
دھڑک رہی تھا تمہارے دل کی دھڑکن کے ساتھ ساتھ
اور میں سن رہی تھی
مسلسل ایک ساتھ
تمہارے دل، تمہارے لاکٹ اور اپنے دل کی دھڑکن

سرد موسم کی محبت

اس دنیا سے اس طرف
خوشبو کے رتھ پر سوار
تمہاری محبت کو انجانے مگر بے پناہ پرکشش جذبوں کی نمی
مجھے اُڑائے لیے جا رہی ہے
ڈھلکتے ہوئے آنسو
بستر کی سلوٹوں کا گداز
نرم، گرم اور سکون آمیز ریشمی تکیوں کا میٹھا لمس
ٹھٹھرتے ہوئے موسم میں برف کی طرح چبھتی ہوئی
وودکا ٹیبل پر
گری ہوئی کریم پف کی گلابی سرگوشی
خدا کہاں ہے
خدا تم ہو
خدا میں ہوں
ہمارے خدا نے ہماری خوشیوں کو
کائنات کے مخروطی پیالے میں
آسمانی ستاروں کی مہربان چھاؤں سے ڈھانپ رکھا ہے
اور جسے ایک نہ ایک دن شاہ بلوط کے عظیم درخت کی
طرح پھیل جانا ہے
جیسے ایک قطرۂ شبنم پھیل کر سمندر میں ڈھل جاتا ہے
جیسے کسی چشم تمنا میں پل بھر کو ٹمٹمانے والے ستارۂ محبت
کی شدت
زمان و مکاں کی ہر حد کو پار کر جاتی ہے
جیسے ایک گلاب ساحل تک پہنچنے کے لیے سمندر کو ایک
قطرۂ شبنم کی طرح
اپنے حوصلے کے پیالے میں بھر کر تباہ شدہ جہاز کی
باقیات کے ساتھ
آخر کار ساحل کو تھام لیتا ہے
سوائے ہم سفر!
محبت کی دنیا کو اپنی ذات کا جوہر بنا لے
کیونکہ محبت خدا ہے
محبت میں ہوں
محبت تم ہو

کملی

سرفراز بیگ/ پیرس

''رَب نواز یہ تو نے کیا کیا۔ تجھے پتا ہے وہ پگلی ہے۔ اُس کا دِماغ ٹھیک نہیں''۔

''بشیر یار کیا بتاؤں۔ مَیں کام سے تھکا ہوا آیا۔ وَردی اُتاری۔ منہ ہاتھ دَھو کے کھانا کھایا۔ اِس کے بعد چائے پی۔ برتن وَغیرہ دَھو کے فارغ ہوا تو سوچا تھوڑا سا آرام کرلوں۔ مَنجی (چارپائی) پے لیٹتے ہی میری آنکھ لگ گئی۔ مجھے بالکل بھی پتا نہیں کہ وہ کب دَروازہ کھول کے کمرے میں آئی اَور یہ سب کچھ ہوگیا''۔ رَب نواز نے مغموم لہجے میں بات جاری رَکھتے ہوئے کہا، کیونکہ وہ اَپنے کیئے پے پشیمان تھا۔

''یار مجھ سے تو بہت بڑا گناہ ہوا ہے، لیکن جب مَیں اِس عمل میں مصروف تھا۔ اُس وَقت میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحتیں سلب ہوچکی تھیں۔ میرے دِماغ پے صرف اِیک ہی بات حاوی تھی کہ کملی اِیک عورت ہے اَور وہ بھی نسوانیت سے بھرپور۔ وہ اِس سارے عمل کے دَوران ہنس رَہی تھی''۔

بشیر نے فکرمندانہ اَنداز میں کہا، ''تجھے پتا ہے اِس محلّے میں چھڑوں (جن کی شادی نہ ہوئی ہو) کو کرائے پے بیٹھک کوئی نہیں دیتا۔ یہ تو بھلا ہو مولوی اَکبر کا کہ اُنہوں نے سفارش کردی وَرنہ یہ بات ناممکن تھی۔ اَب تو نے یہ کام دِکھادیا ہے۔ اَگر کوئی بچہ وَچہ ہوگیا تو کیا کریں گے''۔

رَب نواز دِیوار کی طرف دیکھ رَہا تھا جہاں فلم سٹار ریما کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ بظاہر تو وہ تصویر دیکھ رَہا تھا لیکن دَرحقیقت وہ کچھ اَور ہی سوچ رَہا تھا۔ پھر اَچانک بولا،

''یار مَیں کوئی پہلا شخص تو نہیں ہوں۔ کملی پہلے بھی دَو دَفعہ بچہ ضائع کروا چکی ہے۔ بلکہ محلّے کی عورتوں نے مِل مِلا کے دَائی کو بُلایا تھا اَور اُس کا بچہ ضائع کروادیا تھا۔ پہلے بھی پتا نہیں چلا یہ کام کس کا ہے۔ اَگر اَب کچھ ہوا تو کیسے پتا چلے گا کہ مَیں ہی بچے کا باپ ہوں۔ اِس لیئے تمہیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں''۔

☆

''بُبُو تم اِسے پکڑ کے کہاں سے لائی تھی''؟

''رَحمتاں مَیں کہاں سے پکڑ کے لائی تھی۔ اِیک دِن گھر کے باہر قدم رَکھا تو گھر کی دَہلیز پے اِسے بے سُدھ پایا۔ اِس کی سفید شلوار پے جابجا خون کے دَھبے لگے ہوئے تھے۔ مَیں سمجھی زَخمی ہے۔ اِس کو سہارا دے کر گھر لے آئی۔ بیٹی کو کہا، بڑے دیگچے میں پانی گرم کر۔ اِسے دودھ میں ہلدی مِلا کر پلائی تو اِس نے تھوڑی تھوڑی آنکھیں کھولیں۔ مَیں نے سوچا جب ہوش آئے گا، تھوڑی سنبھلے گی تو کہوں گی، چل جا کے نہالے پھر اَتا پتا پوچھوں گی۔ لیکن اِس نے جیسے ہی تھوڑا ہوش سنبھالا تو ہنسنے لگی۔ مَیں نے پوچھا ہنستی کیوں ہو۔ تم زَخمی ہو۔ تمہیں دَرد نہیں ہو رَہا۔ تمہاری ساری شلوار خون سے بھری پڑی ہے۔ وہ پھر ہنسنے لگی۔ مَیں نے کہا کملی نہ ہو تو۔ وہ دِن اَور آج کا دِن۔ اِس کو سارے محلّے وَالے کملی کہتے ہیں''۔

''لیکن بُبُو ہے کون اَور کہاں سے آئی ہے''؟

بُبُو کو اَیسے سوالوں پے بڑا غصہ آتا تھا۔ اُس کا سوال سُن کر بُبُو کے جسم کا سارا خون سکڑ کے اُس کے چہرے پے آگیا۔ رَگیں تَن گئیں اَور گرج کے بولی،

''رَحمتاں جہاں سے تو آئی ہے نا یہ بھی وُہیں سے آئی ہے۔ رَہا سوال کہ کون ہے۔ تو یہ میرے سوہنڑے رَب کی مخلوق ہے''۔

بُبُو کے تیور بھانپتے ہوئے رَحمتاں نے ذَرا ملائمت کے سے اَنداز میں کہا،

''بُبُو غصہ کیوں کرتی ہے۔ میرا مطلب وہ نہیں تھا جو تو سمجھ رَہی ہے''۔

''رَحمتاں مَیں سب جانتی ہوں تیری باتوں کا کیا مطلب ہوتا ہے''۔

''بُبُو تو نے بتایا نہیں اِس کی شلوار پے خون کیسا تھا؟ وہ کہاں سے زَخمی ہوئی تھی''؟

''رَحمتاں مجھے لگتا ہے تیرا سلسلہ تو بند ہوگیا ہے لیکن کملی بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ اُسے ہر مہینے بعد قدرت کے اِس بنائے ہوئے نظام کا سامنا کرنا پڑتا ہے''۔

''بُبُو آج تو بڑے غصے میں ہے۔ لگتا ہے تیرا مزاج ٹھیک نہیں''۔

''کیا کروں رَحمتاں جب سے کملی میرے گھر سے گئی ہے بے چاری کو لوگ بڑا تنگ کرتے ہیں۔ میرا دِل خون کے آنسو رَوتا ہے لیکن مَیں اُسے اَپنے گھر نہیں رَکھ سکتی''۔

''مگر کیوں''؟ رَحمتاں نے متجسس و متحیر ہوکر

پوچھا۔

بُوبو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگی،

''رحمتاں خدا نے عورت کو بڑا عجیب بنایا ہے۔ یہ ماں، بیٹی، بہن، بیوی ہوتی ہے۔ اِن رشتوں کا لوگ تھوڑا بہت خیال کرتے ہیں۔ کملی کا کسی کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں تھا اور نہ ہے۔ اِس لیئے پہلے میرے پوتے نے پھر میرے بیٹے نے اور آخر میں میرے بابے نے بھی کوشش کی۔ مَیں اُسے گھر میں کیسے رکھتی۔ جب سے میرے ہاں سے گئی ہے دو دفعہ بچہ ضائع کروایا جا چکا ہے۔ مجھے جب بھی ملتی ہے مَیں نہلا دیتی ہوں۔ لیکن ایک دو دنوں بعد پھر ویسی ہی ہو جاتی ہے''۔

بُوبو نے جب اپنی بات ختم کی تو رحمتاں نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔

☆☆☆

وہ عصر کی نماز پڑھنے پہنچا تو مسجد میں کوئی نہیں تھا۔ موسم اچھا تھا اِس نے سوچا صحن میں ہی نماز پڑھتا ہوں۔ اِس نے جلدی جلدی چار فرض پڑھے اور سلام پھیر کے دُعا کے لیئے ہاتھ اُٹھائے۔ دُعا ختم کی اور دونوں ہاتھ منہ پر پھیرے۔ جیسے ہی اُٹھ کے جانے لگا تو پیچھے سے آواز آئی،

''پُتر جانے لگا ہے''۔

اِس نے مُڑ کے دیکھا تو بابا نور دین بیٹھا ہوا تھا۔ وہ جا کے اُن کے پاس بیٹھ گیا۔ اِس کا اِرادہ تھا کہ حال اَحوال پوچھ کے چلتا بنے گا لیکن اُنہوں نے اِسے اپنے پاس بٹھا لیا۔ کام وغیرہ کا پوچھنے لگے۔ سارے محلّے والے بابا نور دین کا اِحترام کرتے ہیں۔ اِن کی عمر کا تو مجھے صحیح اَندازہ نہیں لیکن کافی ضعیف ہیں۔ اِن کے چہرے کے خط و خال بتاتے ہیں کہ جوانی میں بہت خوبصورت تھے۔ اَب بھی بُرے نہیں لگتے، بس آنکھوں کے نیچے اور ماتھے پے کچھ کالے کالے نشان ہیں۔ سر کے بال چاند کی چاندنی کی طرح سفید ہیں اور اِن کے بالوں کو دیکھ کر ایک عجیب قسم کی ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے۔ لبیں کاٹتے ہیں اور داڑھی قریباً دو ہاتھ لمبی ہوگی۔ اِن کی سفید داڑھی، جب کبھی تیز ہوا چلتی ہے تو ہوا میں لہراتی ہے اور بڑی بھلی لگتی ہے۔ ویسے وہ اپنی داڑھی پر دونوں ہاتھ پھیرتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ سارا عمل غیر اِرادی طور پے ہوتا ہے۔ وہ اِس بات سے بے خبر ہوتے ہیں۔ جب کبھی تسبیح کے دانوں پے ہاتھ پھیر رہے ہوں تو اِس عمل میں تھوڑا سا وقفہ آ جاتا ہے۔ سفید رنگ کا شلوار کرتہ پہنتے ہیں۔ اور اِن کے لیئے درزی جو قمیصیں بناتا ہے اُس کے کف ہوتے نہ ہی کالر ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں اِن دونوں چیزوں سے مجھے اُلجھن ہوتی ہے۔ اَرمغان اِنہیں گزشتہ کئی سالوں سے دیکھ رہا ہے۔ دُبلے پتلے سے ہیں۔ پورے جسم پے سفید شلوار کرتہ کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ کسی قسم کی گھڑی یا ہاتھ والی گھڑی، سر پے ٹوپی یا صافہ وہ نہیں اِستعمال کرتے لیکن ایک چیز اِن کے پاؤں میں اُس نے ہمیشہ دیکھی ہے کیونکہ شلوار وہ ہمیشہ ٹخنوں سے اوپر رکھتے ہیں۔ وہ چیز ہے کالے دھاگے میں پروئی ہوئی ایک سفید چیز جس کا حجم ایک تسبیح کے دانے کے برابر ہوگا۔ ایسا لگتا ہے ہاتھی دانت کا کوئی ٹکڑا ہے۔ یہ کالا دھاگہ وہ گزشتہ کئی برسوں سے اِن کے پاؤں میں بندھا دیکھ رہا ہے۔ اَرمغان بچپن سے اِس مسجد میں نماز پڑھ رہا ہے۔ سکول، کالج اور یونیورسٹی کے تمام مدارج سے گزر کر سرکاری ملازمت تک پہنچا۔ ہمیشہ اِس کی بابا نور دین سے ملاقات ہوتی رہی۔ پہلے وہ اِنہیں اِتنا پسند نہیں کرتا تھا لیکن آہستہ آہستہ دونوں میں دوستی ہو گئی کیونکہ وہ اِس سے بہت زیادہ اُنس و لگاؤ رکھتے تھے۔ وہ کہتے تھے اور ہیں کہ یہ نماز کا بڑا پابند ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ گزشتہ بیس سال سے تو تمہیں مَیں دیکھ رہا ہوں۔

جب سے وہ اِس مسجد میں نماز پڑھ رہا ہے یہاں اِس نے مولوی اَکبر کو ہی دیکھا ہے لیکن بابا نور دین اُس کے سخت خلاف ہیں۔ ایک دفعہ اِس نے بابا نور دین سے پوچھا کہ،'' آپ مولوی اَکبر کے خلاف کیوں ہیں''۔ تو اُنہوں نے بتایا کہ،'' بیٹا یہ مولوی بہت بڑا فراڈ ہے۔ یہ دھوکے باز ہے۔ اِس نے اپنے اُوپر شرافت کا ملمع چڑھایا ہوا ہے۔ حقیقت میں یہ ایسا نہیں ہے۔ تم اُس وقت بہت چھوٹے تھے جب یہ اِس محلّے میں آیا تھا۔ تم تو جانتے ہو یہ مسجد ٹھیکیداروں کے بزرگ نے بنائی تھی۔ تم اِس بات سے بھی واقف ہو کہ ٹھیکیدار کیسے لوگ ہیں۔ اُن کے بزرگوں نے جس آدمی کو مسجد کا کرتا دھرتا بنایا تھا وہ منبر پے بیٹھ کے بڑی اچھی اچھی باتیں بتایا کرتا تھا لیکن یہ باتیں ٹھیکیداروں کو پسند نہیں تھیں۔ اُنہوں نے کئی نئے مولوی آزمائے لیکن اُن کے معیار پے کوئی بھی پورا نہ اُترا۔

ایک دِن زوروں کی بارش ہو رہی تھی۔ مَیں اپنے کسی کام سے شہر کی طرف جا رہا تھا۔ جیسے ہی گاڑی سٹارٹ کی تو گاڑی کی ہیڈ لائٹس بارش میں بھیگے ہوئے ایک آدمی پر پڑیں۔ وہ شخص ٹھیک ٹھاک

صحت مند تھا۔ سر پے کالے گھنے بال تھے جو بارش میں بھیگ جانے کی وجہ سے اور بھی عجیب و غریب لگ رہے تھے۔ داڑھی بھی بڑھی ہوئی تھی۔ میلا کچیلا لباس اور پاؤں میں پھٹی پرانی جوتی۔ میں نے شہر جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور اُس شخص کو گھر لے آیا۔ تولیہ دیا، سوکھے کپڑے دیئے اور اُس سے کہا بال خشک کرلو اور بدن بھی پونچھ لو اس کے بعد کپڑے بدل لینا۔ پھر میں تمہاری کہانی سنوں گا۔ تھوڑی دیر میں وہ کپڑے بدل کے میرے سامنے آگیا۔ چوبیس پچیس سال کا نوجوان تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ میں بے سہارا ہوں۔ میرا کوئی گھر نہیں۔ میرے پاس کوئی کام نہیں۔ میں نے اُس کی کہانی پے یقین کرلیا۔ میں نے کہا، تمہارا نام کیا ہے۔ تو کہنے لگا، جو بھی آپ رکھ دیں۔ میں بڑا حیران ہوا۔ مجھے یہ شخص کچھ مشکوک سا لگا لیکن گھر والوں کو بتائے بنا ہی میں نے اس شخص کو ایک رات کے لیئے پناہ دے دی۔ صبح ہوتے ہی میں نے اس سے کہا، تم ٹھیکیداروں کے ہاں چلے جاؤ۔ اُن کے ہاں تمہیں کام بھی مل جائے گا اور رہنے کا ٹھکانا بھی۔ ٹھیکیداروں نے اسے مسجد کی صفائی کے کام پے لگا دیا۔ اس طرح اس شخص نے داڑھی وغیرہ مزید بڑھالی اور وہیں پے رہنے لگا۔ بلکہ اس مسجد میں رہنے لگا جہاں تم نماز پڑھنے آتے ہو۔ آہستہ آہستہ اس نے ٹھیکیداروں کی سیاست کو سمجھنا شروع کر دیا اور اس پرانے مولوی کی جگہ لے لی۔ اب وہ کبھی کبھی نماز بھی پڑھا دیا کرتا پھر آہستہ آہستہ ساری نمازوں کی امامت وہی کرنے لگا۔ آخر کار اس نے جمعے کا خطبہ بھی پڑھنا شروع کر دیا۔ تقریر وغیرہ بھی کرلیا کرتا۔ آدھا گھنٹہ پرانا مولوی تقریر کیا کرتا اور آدھا گھنٹہ یہ۔ آخر کار ایک دن ٹھیکیداروں نے اس مسجد کا کرتا دھرتا اسی شخص کو بنا دیا۔ بارش میں بھیگے ہوئے اس شخص کو لوگ اب مولوی اکبر کے نام سے جانتے ہیں"۔

اس نے کہا، "لیکن وہ تو بڑی اچھی تقریر کرتا ہے"۔

تو بابا نور دین نے اسے بتایا، "پُر تقریر کرنا ایک فن ہے اور وہ اس فن میں بہت ماہر ہے۔ اس نے آتے ہی پہلے مسجد کی صفائی کا کام سنبھالا۔ پھر اسلامی مہینوں کے حساب سے تقریریں رٹنی شروع کیں۔ بازار سے باقاعدہ طور پے مہینوں کی مناسبت سے لکھی ہوئی تقاریر ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ اس نے ہر اسلامی تہوار کے مطابق علم حاصل کرنا شروع کیا۔ زیادہ کمال اس کی آواز کا ہے جو مائیکروفون سے نکل کر لوگوں کے کانوں تک پہنچتی ہے تو بہت بھلی لگتی ہے۔ کیونکہ بہت سے لوگ جب مائیک میں بولتے ہیں تو خود انہیں بھی اپنی آواز پسند نہیں آتی تو لوگوں کے کانوں کو خاک بھائے گی۔ اس کے علاوہ وہ ٹھیکیداروں کو خوب مکھن لگاتا ہے۔ اُن کی خوشامد کرتا ہے اور منبر پر بیٹھ کر بھی اُن کی خوب تعریف و توصیف کرتا ہے اس لیئے اس نے اپنے پاؤں بڑی مضبوطی سے جما لیئے ہیں۔ میں نے کبھی کسی سے اپنے خیالات کا اظہار نہیں کیا نہ ہی اُس رات کا کبھی کسی سے ذکر کیا ہے۔ یہ بات میں جانتا ہوں، مولوی اکبر جانتا ہے اور تم تیسرے آدمی ہو جو اس بات سے واقف ہو"۔

☆☆☆

میں گلی سے گزر رہا تھا مجھے بشیر اپنی بیٹھک کے دروازے میں کھڑا نظر آیا۔ میں نے پاس جا کے ہاتھ ملایا۔ سلام دعا کے بعد میں نے بشیر سے پوچھا، "بشیر باہر کیوں کھڑے ہو"؟

اُس نے مغموم انداز میں کہا، "ارمغان صاحب بجلی نہیں ہے۔ نہ روشنی ہے، نہ پانی ہے نہ پنکھا۔ کام سے تھکا ہوا آیا ہوں۔ ابھی کھانا کھایا ہے۔ سوچا تھا تھوڑا سا آرام کرلوں گا لیکن"۔

اُس نے اپنی بات لیکن پے ہی ختم کر کے میرا حال احوال پوچھنا شروع کر دیا،

"میری چھوڑیں آپ بتائیں آپ کیسے ہیں"؟

میں نے بھی ایک سرد آہ بھر کے کہا، "میں ٹھیک ہوں، وہی مسئلہ ہے بجلی کا۔ اچھا خیر چھوڑو یہ بتاؤ کیسی لگی شہاب نامہ"۔

"ارمغان صاحب بہت اچھی کتاب ہے۔ میں نے ساری پڑھ لی ہے ایک دو دفعہ رویا بھی ہوں۔ خاص کر ڈپٹی کمشنر کی ڈائری تو اس کتاب کی جان ہے۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ ایک سرکاری افسر اتنا ایماندار بھی ہو سکتا ہے"۔

"بس بشیر دُنیا میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ اگر نیک لوگ دُنیا سے بالکل ختم ہو جائیں تو یہ دُنیا ختم ہو جائے گی"۔

"آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں ارمغان صاحب۔ اچھا یہ بتائیں کوئی اور کتاب ہے"۔

"ہاں علی پور کا ایلی ہے، ممتاز مفتی کی۔ اچھی کتاب ہے"۔

"اگر یہ بات ہے تو وہ مجھے ضرور دیجیئے گا"۔

"بشیر، رب نواز نظر نہیں آرہا"۔

"اُس کی آج شام کی ڈیوٹی ہے"۔

"اچھا بشیر ے میں اب چلتا ہوں۔ مغرب کی

نماز جب پڑھنے آؤنگا تو تمہارے لیئے علی پور کا ایلی لیتا آؤنگا۔ یہ بڑی اَچھی بات ہے کہ تم نماز پڑھتے ہو لیکن رَب نواز کبھی نہیں آیا۔ اُس کو بھی ساتھ لے آیا کرو"۔

"بس جی کیا کروں، اُس کی اَپنی مرضی ہے۔ ہم دونوں اِیک ہی گاؤں کے ہیں لیکن وہ مجھ سے تھوڑا مختلف ہے"۔

اِس بات کو سُن کے مَیں چلتا بنا لیکن اَبھی دَس قدم ہی چلا ہونگا کہ مجھے بُو اَپنے گھر کے دَروازے کے سامنے کھڑی نظر آئی۔

مَیں نے کہا، "بُو اَسلام وعلیکم"۔

بُو نے بڑے پیار بھرے اَنداز میں کہا، "وعلیکم اَسلام اَرمان پُتر"۔ بُو مجھے اَرمغان کے بجائے اَرمان کہتی ہے۔

بُو مجھ سے پھر مخاطب ہوئی، "پُتر اُس بیٹھک والے سے کیا باتیں کر رَہا تھا"؟

"کچھ نہیں بُو، بشیرے کو کتابیں پڑھنے کا بڑا شوق ہے۔ مجھ سے کبھی کبھی کتابیں مانگ کے پڑھ لیا کرتا ہے۔ وَیسے مسجد میں بھی ملاقات ہوتی ہے"۔

"تجھے پتا ہے کل اِنہوں نے کیا کیا"؟

مَیں نے لاعلمی کے سے اَنداز میں کہا، "نہیں"۔

"اِنہوں نے گملی کے ساتھ"۔

مَیں نے بُو کو وَکیلوں کے سے اَنداز میں کہا، "نہیں بُو یہ تو پردیسی ہیں۔ بڑے شریف ہیں"۔

پُتر مجھے خود گملی نے بتایا ہے۔ وہ کہہ رَہی تھی بُو بڑا مزہ آیا"۔

"بُو آپ بھی کس کی بات پے یقین کر رَہی ہیں۔ وہ تو گملی ہے۔ کل وہ آپ کو میرے بارے کچھ کہے گی تو آپ مان جائیں گی"۔

"نہیں پُتر تو بڑا شریف ہے۔ مَیں جانتی ہوں"۔

مجھے بُو کی یہ بات بالکل پسند نہ آئی کیونکہ مَیں اُس کی بہت عزت کرتا ہوں۔ اِس لیئے مَیں نے جان چھڑانے کے سے اَنداز میں کہا، "اَچھا بُو میں چلتا ہوں۔ کام سے تھکا ہوا آیا ہوں۔ نہا دھو کے تھوڑا سا آرام کروں گا"۔ مَیں نے اِتنا کہا اَور گھر کی راہ لی۔

☆☆☆

مولوی اَکبر اَپنے حجرے میں بیٹھا اَپنے دَو شاگردوں سے گفت وشنید کر رَہا تھا۔ عمیر اَور عنان اُس کے خاص بندے تھے۔ اُس کی ہر بات کی اِن دَونوں کو خبر ضرور ہوتی لیکن کچھ باتیں وہ اِن سے بھی پوشیدہ رَکھتا۔ سارے محلّے کے لوگ اُس کی بہت عزت کرتے تھے۔ یہ مقام مولوی اَکبر نے پچیس سال کے عرصے میں حاصل کیا تھا۔

مولوی اَکبر کا قد ٹھیک ٹھاک تھا اَور جسم بھی بھاری بھرکم تھا۔ رَنگ گوراچٹا اَور چہرے پے کالی سیاہ دَاڑھی (جو کہ وہ خضاب سے رَنگتا تھا اِتنی باقاعدگی سے کہ ذَرا سے سفید بال نمودار ہوتے تو وہ فوراً حمام پے جا کے اُن کو رَنگوا لیا کرتا)۔ مونچھیں اُس کی کٹی ہوئی ہوتیں لیکن اُوپر وَالے ہونٹوں پے جہاں مونچھیں نمودار ہوتی ہیں اُس کی کٹی ہوئی مونچھوں کے باوجود ہاں! ایک عکس سا دِکھائی دیتا۔ اُس کے سر کے بال کبھی نظر نہ آئے کیونکہ وہ ہمیشہ اَپنے سر کو کسی نا کسی چیز سے ڈھکے رَکھتا۔ اُس کے پاس اِیک خاص قسم کا پگڑ تھا جو کہ کالے اَور سبز رَنگ کا بنا ہوا تھا۔ نماز وَغیرہ کے دَوران وہ ٹوپی کا اِستعمال نہ کیا کرتا بلکہ اُسی طرح کا اِیک چھوٹا سا عمامہ اِستعمال کیا کرتا۔ مولوی اَکبر کے ہاتھ گورے گورے تھے لیکن اُن پے کثرت سے بال ہونے کی وَجہ سے اُن ہاتھوں میں مزید خوبصورتی پیدا ہو جاتی۔ اُس کے ہاتھ نرم اَور گرم ہوتے کیونکہ جب بھی کوئی اُس سے ہاتھ ملاتا تو وہ ہاتھ ملانے وَالے کا ہاتھ چند لمحوں کے لیئے اَپنے ہاتھ میں رَکھتا اَور اُس کی پوری کوشش ہوتی کہ ہاتھ کھینچ کر اُس شخص کو گلے لگا لے۔ لیکن آجکل گلے ملنے کا یا سینے سے لگانے کا اِتنا رواج نہیں رَہا اِس لیئے لوگ زیادہ تر ہاتھ چھڑا لیتے اَور گلے ملنے کے عمل سے اِجتناب فرماتے۔

مولوی اَکبر کا پیٹ بہت زیادہ نکلا ہوا تھا لیکن وہ شلوار، قمیص کے اُوپر کبھی کالا اَور کبھی سبز رَنگ کا چُوغا اِستعمال کیا کرتا جس کی وَجہ سے اُس کے پیٹ کی نمائش کم ہوتی۔ وہ ناک نقشے کے لحاظ سے خوبصورت تھا اَور اُس کی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ اُس کے سامنے بیٹھ کے اَیسا لگتا، جیسے اُس نے سامنے وَالے شخص پے کوئی اِسمِ اَعظم پھونک دِیا ہے۔ یا وہ ہپناٹزم یا میسمیرزم کا ماہر ہے۔ آج سے پچیس سال پہلے مولوی اَکبر، ٹھیکیداروں کی اِس مسجد میں جھاڑو دِیا کرتا تھا۔ اذان دِیا کرتا تھا۔ اِس کے علاوہ پرانے مولوی کے پاؤں دَابہ کرتا تھا لیکن جب اِس نے مسجد کا اِنتظام و اِنصرام سنبھالا تو اِس نے چھوٹی سی مسجد کو بڑا کرنا شروع کر دِیا۔ اَپنی شعلہ بیان تقریروں سے لوگوں کو اِس حد تک قائل کیا کہ لوگوں نے کثرت سے چندہ دینا شروع کر دِیا۔ اِس طرح یہ چھوٹی سی مسجد بہت بڑی مسجد بن گئی اَور اِس کے ساتھ ساتھ جمعے کے اِجتماع میں بھی اِضافہ ہونے لگا۔ آہستہ آہستہ لوگوں کو مولوی اَکبر کی تقریروں کا چسکہ پڑ گیا۔ لوگ اِس کی تقاریر ٹیپ ریکارڈرز میں ریکارڈ کرنے لگے۔ اِسے تقریر

کرنے میں اِتنا ملکہ حاصل ہوگیا کہ دوسرے محلّے کے لوگ بھی اِسے تقاریر کے لیئے بُلانے لگے۔ وہ باقاعدہ تقریر کرنے کے پیسے لیا کرتا۔ اُس کا یہ تقریر کرنے کا فن اُسے اِنگلستان تک لے گیا۔ اَب وہ صرف مولوی اَکبر نہیں تھا بلکہ مُبلغِ یورپ کے نام سے جانا جانے لگا۔ اُس کے پاؤں اِتنے مضبوط ہو چکے تھے کہ ٹھیکیدار بھی اُس کی شہرت سے خائف تھے۔ اُس کے بارے میں یا مخالفت میں، مَیں نے اَگر کسی کے منہ سے بات

سُنی تھی۔ تو وہ تھے بابا نور دِین۔ باقی محلّے کے بچے، بوڑھے، جوان، عورتیں جوان لڑکیاں سب اُس کے گرویدہ تھے۔

جمعے وَالے دِن لوگ دُور دُور سے اُس کی تقریر سننے آتے۔ عورتیں گھر بیٹھ کے اُس کی تقریر سُنا کرتیں۔ وہ تقریر کے دَوران دَو طرح کی آوازیں اِستعمال کیا کرتا۔ اِیک اَنداز تو اُس کا اَیسا ہوتا جیسے وہ گریہ وزَاری کر رَہا ہو۔ جس جملے کو وہ گریہ وزَاری کے اَنداز میں بیان کرتا اُسی جملے کو وہ دُوسرے اَنداز میں اِنتہائی گرجدار اَور بلند آواز میں کہتا تو سننے وَالوں پے اِیک عجیب سا سحر طاری ہو جاتا۔ تقریر سننے وَالوں کو اَیسا لگتا جیسے جنگِ بدر کا میدان اُن کے سامنے ہے اَور گھمسان کا رَن پڑا ہے اَور کفارِ مکہ، مسلمانوں کے ہاتھوں شکستِ فاش سے دَوچار ہورَہے ہیں۔ اِس طرح کی تقاریر رَمضان کے مہینے کے لیئے مخصوص تھیں۔ اِس کے علاوہ محرم الحرام اَور رَبیع الاوّل کی مناسبت سے بھی اُس کی تقاریر بڑی شعلہ بیان ہوا کرتیں۔ محرم کے مہینے کے لیئے تو وہ خاص طور پہ تیاری کیا کرتا۔ باقاعدہ دیگیں پکتیں اَور لوگوں میں کھانا تقسیم کیا جاتا۔ وہ اَہلِ سنت وَل جماعت کے علاوہ اَہلِ تشیع میں بھی یکساں مقبول تھا۔

☆☆☆

اَرمغان، مولوی اَکبر، گملی، بابا نور دِین، بُوحتیٰ کہ بشیر اَور رَب نواز بھی اِیک اَیسے محلّے میں رَہتے تھے جس کا عنانِ حکومت ٹھیکیداروں کے پاس تھا۔ اُنہوں نے اِس محلّے کا اِنتظام و اِنصرام اِس طرح سنبھالا ہوا تھا کہ کوئی بھی شخص اُن کی مرضی کے خلاف کوئی بھی کام نہیں کرسکتا تھا۔ شادی ہو یا فوتیدگی ہو، اِلیکشن ہوں یا عید میلاد النبی کا جلوس ہو، عید، بکرعید سب کچھ اِنہی کی مرضی سے ہوتا تھا۔ محلّے کے پرانے لوگ جانتے تھے کہ اِن ٹھیکیداروں کا دادا اَنگریزوں کے دَور میں ٹھیکے لیا کرتا تھا۔ ہوتا کچھ یوں کہ اَنگریزوں کے زیادہ تر ٹھیکے پنڈی میں رَہنے وَالے سکھوں کو ملا کرتے۔ پھر وہ سکھ چھوٹے موٹے ٹھیکے کسی نا کسی مسلمان کو دے دِیا کرتے۔ اِنہی ٹھیکوں میں سے چند اِیک ٹھیکے جس بڑے ٹھیکیدار کو ملتے۔ وہ اِیک دو ٹھیکے اِن ٹھیکیداروں کے دادا کو دے دِیا کرتا۔ اِس طرح یہ لوگ ٹھیکیداروں کے نام سے جانے جانے لگے۔ پھر جب پاکستان بنا تو اَنگریز بھی چلے گئے اَور سکھ بھی۔ اِس طرح بڑے ٹھیکدار کے ساتھ ساتھ اِن ٹھیکداروں کا دادا پنڈی کا دُوسرے نمبر کا بڑا ٹھیکیدار بن گیا۔ کینٹونمنٹ کے ہر اَیکسی

اَین کے ساتھ اِن کے اَچھے تعلقات ہوتے۔ بیشمار اَلاٹمنٹس اَور جگہیں اِنہوں نے حاصل کیں۔ اِس کے علاوہ کئی غیر آباد جگہیں اِنہوں نے اَیکسی اَین کے ساتھ مِل مِلا کے ننانوے سال کی لیز پے حاصل کرلی تھیں۔ اَب اِن کی تیسری نسل کو پنا کام کے کھانے کی عادت پڑ چکی تھی۔ رَوپے پیسے کی کمی نہ تھی جس کی وَجہ سے اِن کی تیسری نسل میں بیشمار معاشرتی برائیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ جس میں شراب، جواء اَور زِنا معمولی بات تھی۔

اِنہوں نے محلّے کو اِیک چھوٹی سی سٹیٹ بنایا ہوا تھا۔ جہاں اِن کی اَپنی بادشاہت تھی۔ بالکل رَومن طرزِ حکومت۔ اِیک طرف دُنیاوی سیاست میں اِن کا رَاج تھا تو دُوسری طرف مولوی اَکبر کی شاہاشی تھی۔ یعنی لوگوں کی آنکھوں میں دَھول جھونکنے کے لیئے وہ مذہب کو ساتھ ساتھ لے کر چلتے۔ پورے محلّے میں دَو ہی گھر اَیسے تھے جو اِن کے جعلی دَبدبے میں نہ تھے۔ وَرنہ سارے محلّے وَالوں کا اِن سے کوئی نا کوئی کام ہوتا۔ کسی کو بیٹی کی شادی کے لیئے اُدھار چاہیئے ہوتا، کسی نے اَپنے بیٹے کو نوکری دِلوانی ہوتی۔ ہر شخص کا کسی نا کسی وَجہ سے اِن سے تعلق تھا۔ دَو گھر جو اِن کی باج گزاری میں نہیں تھے۔ اُن میں

اِیک اَرمغان کا گھر تھا۔ اِس کے وَالد سچے اَور کھرے مسلمان تھے۔ یہی عادات و اَطوار اَرمغان کے بھی تھے۔ دُوسرا شخص تھا بابا نور دِین کیونکہ وہ اِن ٹھیکیداروں کی اَصلیت سے وَاقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اِن ٹھیکداروں کا نیک عمل بھی اَپنے مکر و فریب کو چھپانے کے لیئے ہوتا ہے۔ پیسے سے سب کا منہ بند کیا جاسکتا ہے لیکن اَرمغان وَغیرہ کے ہاں پیسے کی قلت نہ تھی کیونکہ اِن کا گھرانہ قناعت پسند تھا اَور دُوسری طرف بابا نور دِین مالی لحاظ سے آسودہ تھا۔ اُس کو پیسے دَھیلے کی کمی نہ تھی۔ ٹھیکیدار جانتے تھے کہ بابا نور دِین پانچ نہیں تو دَس سال اَور جی لے گا لیکن اَرمغان کو رَام کرنے کے لیئے وہ کئی حیلے بہانے ڈھونڈتے

تڑپتے۔ حتیٰ کہ وہ اِسے اَپنا دَاماد بنانے کو بھی رَاضی تھے لیکن اَرمغان مطلق العنان تھا۔ اَپنی

دُنیا میں خوش تھا اَور شادی بیاہ کی تمام ذِمہ دَاری اِس نے ماں باپ پر چھوڑی ہوئی تھی۔ اِس کا خیال تھا جب بھی اِس کے ماں باپ کہیں گے جہاں کہیں گے وُہاں شادی کر لے گا۔

☆☆☆

آج سے تین سال پہلے جب گُملی اِن ٹھیکیداروں کے محلّے میں آئی تھی تو اُس کی عمر پندرہ سال تھی۔ اَور جس گھر میں اُس کو پہلی دَفعہ پناہ ملی تھی، وہ بُبّو کا گھر تھا۔ گُملی کا دِماغی توازن ٹھیک نہیں تھا۔ وہ بالکل پاگل تھی یا کسی گہرے صدمے کا شکار تھی۔ اِس بات سے کوئی وَاقف نہیں۔ اِس لیئے نہ تو اُس کے اَصلی نام سے کوئی وَاقف تھا اَور نہ ہی کوئی یہ جانتا تھا کہ گُملی کہاں سے آئی ہے۔ سارے محلّے وَالے اِسے گُملی کہہ کر بلاتے اَور گُملی اِس بات سے شناسا تھی کہ لوگ اِسے گُملی کہہ کر بلاتے ہیں۔ وہ گُملی لفظ سنتے ہی مسکرانا شروع کر دیتی۔ پھر وہ زَور زَور سے قہقہے لگاتی، اِس کے بعد بڑی دِیر تک تالیاں بجاتی رَہتی۔

گُملی کا رَنگ بہت زیادہ گورا تھا اَور آنکھیں بڑی بڑی، قد کاٹھ ٹھیک تھا اَور صحت بھی بہت اَچھی تھی۔ ناک نقشہ اَیسا تھا کہ میلے کچیلے کپڑوں میں بھی خوبصورت لگتی۔ اُس کے جسم میں اِتنی کشش تھی کہ وہ حقِ نسوانیت بھرپور طور پے ادا کرتا تھا۔ جب کبھی وہ قہقہے لگا ہنسا کرتی تو اَیسا لگتا جیسے پورے جسم کا خون سِمٹ کے اُس کے گالوں پے آ گیا ہو۔ اَیسا لگتا تھا کہ اُس کے رَس بھرے اَنار اَبھی پُھوٹ جائیں گے اَور تازہ تازہ خون کا سا رَنگ اُس کے گالوں سے بہنے لگے گا۔ گُملی اِس بات سے ناوَاقف تھی، یہ سوچنے سے عاری تھی کہ اُس کی بھرپور جوانی دِیکھ کر لوگوں کا دِل مچل جاتا ہے اَور اِس محلّے کے بیشمار مرد جن میں جوان، نوجوان، مرد، حتیٰ کہ بوڑھے بھی اُس کے گورے جسم کا لمس محسوس کرنے کے لیئے اَپنے تئیں تڑپتے ہوں گے۔ کتنے ہی نوجوان رَات کو سونے سے پہلے گُملی کو تصور میں لاتے ہوں گے اَور نہ جانے خیال ہی خیال میں اُس کے ساتھ کیا کچھ کر گزرتے ہوں گے۔ آتے ہی وہ جب بُبّو کے ہاں چند ماہ رَہی تو تین مختلف لوگوں کے دِل مچلے۔ جس میں بیٹا، باپ اَور دادا شامل تھے۔ جب بُبّو نے گُملی کو گھر سے فارغ کیا تو فوراً ہی اِسے اِیک اَور گھر میں پناہ مل گئی۔ اِس طرح گُملی کو اِس محلّے میں رَہتے ہوئے تین سال ہو چلے تھے۔ اَور اُس کی خوبصورتی میں کمی ہونے کے بجائے اِضافہ ہی ہو رَہا تھا۔ اَب اِس کی جوانی کپڑوں سے چھَن چھَن کے باہر آنے لگی تھی۔ کئی دَفعہ اَیسا ہوتا کہ وہ اَپنی ٹانگ کُھجانے کے لیئے گلی میں کہیں بیٹھ جاتی اَور اَپنی شلوار گھٹنوں سے اُوپر تلک اُٹھا لیا کرتی اَور رَاستے سے گزرنے وَالے لوگوں کی پرواہ کیئے بغیر وہ اَپنے کام میں مصروف رَہتی۔ نوجوان لڑکے اَیسے مناظر دیکھ کر دِل ہی دِل میں مچلا کرتے۔ وہ اَپنے دِماغ کے نہاں خانوں میں بے شمار خواب و خیال تخلیق کر لیا کرتے اَور اِن میں سے جیسے ہی کسی کو موقع ملتا وہ اِس سنہرے موقعے کا بھرپور طریقے سے فائدہ اُٹھایا کرتا۔ گُملی دَو دَفعہ حاملہ بھی ہوئی لیکن دَونوں دَفعہ محلّے کی عورتوں نے مِل ملا کے بچہ ضائع کروَا دِیا۔ عام طور پے عورتیں جب اِس عمل سے گزرتی ہیں، عرفِ عام میں جب وہ پیٹ کو صاف کروَاتی ہیں تو اُن کا جسم یا تو پھولنے لگتا ہے یا وہ اِیک دَم موٹاپے کا شکار ہو جاتی ہیں، اُنہیں ہمیشہ کے لیئے کوئی نا کوئی عارضہ لاحق ہو جاتا ہے۔ لیکن گُملی کے ساتھ اَیسا کچھ نہیں ہوا۔ اُس کی صحت بالکل ٹھیک تھی اَور وہ موٹاپے کا بھی بالکل شکار نہ ہوئی۔ وہ اَپنا خوبصورت جسم، خوبصورت چہرہ اَور نسوانیت سے بھرپور پیکر لیئے کبھی اِیک گلی میں پائی جاتی اَور کبھی دَوسری گلی۔

☆☆☆

بابا نور دِین، مولوی اَکبر کے پیچھے نماز نہیں پڑھتا تھا اِس لیئے وہ جماعت کے بعد مسجد میں وَارد ہوا کرتا اَور اَپنی نماز مکمل کر کے کافی دِیر تک تسبیح پڑھتا رَہتا۔ بابا نور دِین کو لوگ چند سال ہوئے اِسی نام سے پکارتے تھے وَرنہ اُس کا پرانا نام تو اَین ڈی تھا اَین ڈی یعنی نور دِین۔ نور دِین نے فلسفے میں اَیم اَے کیا لیکن کوئی بھی نوکری کرنے کے بجائے اَپنا کاروبار شروع کیا حالانکہ جب نور دِین نے اَیم اَے کیا تھا اُن دِنوں پڑھے لکھے لوگوں کی کافی مانگ تھی۔ لیکن نہ جانے اُس کے جی میں کیا آئی کہ غیر ممالک سے تیزاب اِمپورٹ کرنے کا کام شروع کیا اَور کام میں خوب مال بنایا۔ یورپ کے کئی ممالک کی سیر کی اَور بے شمار کتابیں اَکٹھی کیں۔ ہمیشہ اَچھے کپڑے پہنے۔ کوٹ پتلون اَور ٹائی نور دِین کا پسندیدہ لباس تھا۔ اِس کے علاوہ کبھی کبھی فیلٹ ہیٹ بھی پہن لیا کرتا لیکن اِس کا اِستعمال خاص مواقعوں پر کیا کرتا۔ نور دِین کے دَونوں بیٹوں نے بھی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اِس کاروبار میں قدم رَکھا اَور اِس کو مزید ترقی دِی۔ اِس محلّے میں اُس کے تین گھر تھے۔ اُس نے

لالہ زار میں بھی بہت بڑی کوٹھی خرید رکھی تھی۔ اس کے علاوہ ترلائی میں اُس کا فارم ہاؤس تھا۔ نور دین کو شروع میں محلّے کے سارے لوگ دہریہ سمجھتے تھے۔ کئی ایک نے تو اُسے تین گُلر کے فتوے بھی لگا رکھے تھے۔ اس کی وجہ صرف اور صرف اِتنی تھی کہ نور دین کے گھر میں بھگوت گیتا، رامائین، مہابھارت، اُپنشد، رگ وید، یجروید، سام وید اور اتھروید کے علاوہ سدھارتھ گوتما بدھا کی جاتکائیں بھی تھیں۔ جن میں دیپنکارا جاتکا، دھمپدہ اور تانترک بدھ ازم تھا۔ یہ سب کتابیں اُس کے ہاں کو موجود تھیں۔ بائبل کا عہد نامہ عتیق اور عہد نامہ جدید دونوں ہی اُس کے پاس تھے۔ یہودیوں کے مذہب کے بارے میں بھی دو تین کتابیں تھیں۔ نور دین ہن ین سے بھی متاثر تھا۔ پھر نور دین پرویز کی کتابیں پڑھنے لگا۔ اس کے بعد ڈاکٹر غلام جیلانی برق اور سید امیر علی کی باری آئی۔ نور دین نہ سُنی تھا نہ ہی شیعہ اور نہ ہی وہابی تھا۔ اُس کا اپنا علیحدہ مسلک تھا۔ آہستہ آہستہ اُس نے اس طرح کی تمام سرگرمیاں ترک کر دیں اور سیدھا سادہ مسلمان بن گیا۔ نماز پڑھتا اور روزے رکھتا۔ زکوٰۃ دیتا، قربانی دیا کرتا۔ انگریزی لباس پہننا بالکل ترک کر دیا تھا اب صرف اور صرف سفید شلوار کرتہ پہنا کرتا۔ جس کی وجہ سے اَین ڈی یعنی نور دین، بابا نور دین بن گیا تھا اور پاؤں میں کالی ڈوری میں سفید رنگ کا منکا ہمیشہ کے لیئے باندھ لیا تھا۔ اس ڈوری کا مطلب تھا

دُنیا کی تاریکی جو کہ ہمیشہ اس دُنیا پے چھائی رہتی ہے اور یہ کبھی زلزلے کی شکل میں کبھی سیلاب کی شکل میں اور کبھی ملکی انتشار کی شکل میں سامنے آتی ہے۔ دُنیا کی تاریکی میں فوجی حکومت اور جمہوریت بھی شامل تھے۔ اس میں سفید رنگ کا ہاتھی دانت کا منکا اس بات کی علامت تھا کہ دُنیا میں ایک اُمید کی کرن باقی ہے جس کی وجہ سے لوگ جیئے جا رہے ہیں حتیٰ کہ لوگ اس دُنیا سے چلے جاتے ہیں لیکن یہ چھوٹی سی اُمید کی کرن ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ اس منکے میں ایک چھوٹا سا کالا نقطہ تھا جس کا مطلب تھا اس اُمید کی کرن میں تھوڑا سا کھوٹ ہے۔ جب یہ کھوٹ دور ہو جائے گا تو تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔ یہ فلسفہ کچھ کچھ ہن ین سے ملتا جلتا تھا۔ اس کے پاؤں میں بندھا ہوا یہ چھوٹا سا زیور ہمیشہ اس کو اس فلسفے پے قائم رہنے کی یاد دلاتا اور ترغیب دیتا۔ گُلی کے بارے میں بابا نور دین کا خیال تھا کہ یہ اس محلّے کے لوگوں کا امتحان ہے جس میں لوگ بری طرح فیل ہوئے ہیں۔ یا چند ایک لوگ جو پاس ہو گئے ہیں اُن کی وجہ سے کوئی مصیبت و آلام نہیں آیا۔

☆☆☆

رب نواز کا کیا ہوا عمل رنگ لایا اور گُلی ایک دفعہ پھر حاملہ ہو گئی۔ اب کے سارے محلّے میں یہی چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں کہ بچے کا باپ رب نواز ہے۔ بُو کو تو پہلے ہی پتا چل چکا تھا لیکن گُلی دو تین ماہ کہیں غائب رہی اور اتنی مدت بعد نظر آئی کہ جب محلّے کی عورتوں نے بچہ ضائع کرنے کے لیئے دائی کا انتظام کیا تو دائی نے صاف انکار کر دیا کیونکہ بہت زیادہ مدت گزر چکی تھی۔ ایک دو لیڈی ڈاکٹروں سے بھی بات کی تو اُنہوں نے بھی انکار کر دیا۔ اب گُلی سرسوں کی طرح پھولی ہوئی گلیوں میں آوارہ پھرتی۔ اس بات سے بابا نور دین، ارمغان، مولوی ابوبکر اور ٹھیکیدار بلکہ ٹھیکیداروں کا پورا کنگڈم واقف تھا۔ رب نواز کو کسی بات کا خوف نہیں تھا کیونکہ وہ اس بات سے واقف تھا کہ گُلی ہر جگہ گھومتی رہتی ہے۔ اس لیئے میں اکیلا تو نہیں جس سے یہ غلطی یا گناہ سرزد ہوا ہے۔ خدا خدا کر کے بچے کی پیدائش کا دن قریب آیا۔ گُلی کو ٹھیکیداروں کے گھر لے جایا گیا اور اُنہوں نے اپنے پارسا اور نیک ہونے کا خوب ڈھونگ رچایا۔ گُلی نے مرے ہوئے بچے کو جنم دیا لیکن اُس کی شکل کس سے ملتی تھی یہ بات دائی نے کسی کو نہ بتائی۔ اُس کا منہ ٹھیکیداروں نے بہت ساری رقم دے کے بند کر دیا تھا۔

اس واقعے کے بعد ٹھیکیداروں کے گھر ایک میٹنگ بلائی گئی جس میں گُلی کے مسئلے پے غور کے لیئے سب کو بُلایا گیا۔ سب کا مشترکہ فیصلہ تھا کہ اسے پاگل خانے بھیج دیا جائے لیکن بُو نے اس بات کی سخت مخالفت کی۔ آخرکار ٹھیکیداروں نے گُلی کا آپریشن کروا دیا تاکہ گُلی دوبارہ کبھی ماں نہ بن سکے اور نہ ہی قدرت کے اس ماہ وار عمل سے گزرے۔

اس واقعے کے بعد جب ارمغان کی ملاقات بابا نور دین سے ہوئی تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اُن کے پاؤں میں وہ کالا دھاگہ نہیں تھا۔ جب ارمغان نے دھاگے کے بارے میں پوچھا تو بابا نور دین کہنے لگا، ''میرا فلسفہ غلط ہے''۔

گُلی اُسی طرح گلی گلی پھرتی اور اُس کے منہ سے ایک ہی بات نکلتی، ''مولوی اکبر کہتا ہے اب کوئی خطرہ نہیں، اب کوئی خطرہ نہیں، اب کوئی خطرہ نہیں''۔

☆☆☆

امن کا لبادہ

او ہینری/احمد عدنان طارق/فیصل آباد

(The Robe of Peace)

جونی بیل چیمبر کو لاپتہ ہوئے ایک سال ہونے کو آیا تھا اور شہر میں اس کی گم شدگی کے متعلق پے در پے اتنی افواہیں گردش میں رہیں کہ اب نہ تو لوگ اُسے خبروں میں تلاش کرتے تھے اور نہ ہی اُس کے دوست اس کی پراسرار گمشدگی کے متعلق بات کرتے تھے لیکن کچھ ہی دن پہلے اس کی گم شدگی اب راز نہیں رہی تھی لیکن اگر اس راز کا عقدہ کھلا بھی تو عام آدمی کو تو سمجھ ہی نہیں آئی کہ آخر اس رازداری کی وجہ کیا تھی لیکن اُس کے قریبی دوست جو ذہنی طور پر اس کے قریب تھے وہ شاید اس رازداری کی وضاحت کر سکتے تھے۔

جونی بیل چیمبر ایک جانا مانا چہرہ تھا اور حقیقت میں شہر کی اصل اشرافیہ سے اُس کا تعلق تھا۔ وہ ہر لحاظ سے ایسا تھا کہ اس کی ہر حرکت سے نیا فیشن جنم لیتا تھا اور اس کے روئیں روئیں سے امارت جھلکتی تھی۔ یعنی اس کی ذات میں کسی بھی قسم کی کوئی کمی نہیں تھی جس سے اشرافیہ میں کسی سے اس کا رتبہ کم کیا جا سکے۔ کپڑے پہننے میں البتہ اُس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ وہ اس طرح کپڑے پہنتا کہ لوگ اس کی نقل کرنے میں بھی فخر محسوس کرتے۔ اس کے پاس عمدہ کپڑوں کی بھرمار تھی جنہیں وہ انتہائی نفاست سے زیب تن کرتا۔ بلا مبالغہ اُسے نیویارک شہر کا سب سے خوش پوش شخص کہا جا سکتا تھا بلکہ پورے امریکہ کا۔

شہر میں ایسے درزیوں کی بھرمار تھی جو اُٹھتے بیٹھتے اُس کے لیے کپڑے سینے کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ وہ یہ کام اُجرت کے بغیر کرنا چاہتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ جونی ان کے بنائے ہوئے کپڑے پہن ہی لے گا تو وہ شہرت کی بلندیوں کو چھو لیں گے۔ اچھی پتلون پہننا جونی کا شوق تھا۔ پتلون کی سلائی میں اُسے درزی کی سو فیصد مہارت کی ضرورت تھی۔ جونی کو پتلون کی شکن نظر آنے کا مطلب تھا کہ وہ پتلون درزی کے ہاتھوں میں ہی پھاڑ دے گا۔ اس کے گھر میں ایک ملازم کا کام ہی صرف یہی تھا کہ وہ اس کی پتلونوں پر استری پھیرتا رہے۔ اُس کے دوستوں کا اس بات پر مکمل یقین تھا کہ تین گھنٹے سے زیادہ وہ ایک لباس نہیں پہنتا تھا۔

بیل چیمبر اچانک ہی غائب ہو گیا۔ تین دن تک تو اُس کے قریبی دوستوں کو پریشانی لاحق نہیں ہوئی۔ پھر وہ سارے اس کی سن گن میں لگ گئے لیکن کسی کو اُس کی بھنک تک نہ لگی۔ وہ اپنے پیچھے کوئی نشان چھوڑ کر نہیں گیا تھا۔ پھر اُس کی گمشدگی کی وجہ کے بارے میں غور ہونے لگا لیکن کوئی وجہ نہ مل سکی۔

اس کا دشمن کوئی نہیں تھا۔ اُس نے کسی کا کچھ دینا نہیں تھا اور عورتیں کبھی اُس کی کمزوری نہیں رہی تھیں۔ اس کے بینک میں تب بھی کئی ہزار ڈالر موجود تھے۔ اُسے کبھی کسی ذہنی بوجھ کا شکار نہیں دیکھا گیا تھا۔ بلکہ وہ ایک مطمئن اور معتدل شخصیت کا مالک شخص تھا۔ اسے تلاش کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی گئی لیکن کہیں اُس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ یہ کہانیوں میں پڑھے ہوئے واقعات کی طرح کی گمشدگی تھی جہاں کوئی گم ہوا تو لگا کہ گویا گم شدہ شخص کو زمین نگل گئی ہو۔

پھر مئی کے مہینے میں بیل چیمبر کے دو قریبی دوست ٹائم آئرز لینسی لوٹ گیلیان یورپ کی سیر کے لیے نکلے۔ سوئٹزرلینڈ اور اٹلی میں آوارہ گردی کے دوران کوہ الپس میں انہیں ایک خانقاہ کے بارے میں معلوم ہوا۔ باہر سے آئے ہوئے سیاحوں کے لیے تو وہ ایک مافوق الفطرت جگہ ہی تھی۔ عام سیاحوں کی پہنچ سے بہت باہر یہ خانقاہ ایک بہت ناہموار عمودی چٹان پر کھڑی تھی۔ اس خانقاہ میں ایک پراسرار کشش ضرور تھی لیکن لوگوں کو اس کے بارے میں بہت کم جانکاری تھی لیکن پھر وہاں کے بھکشوؤں کی ریاضت اور ان کی دعاؤں میں برکتوں کا ذکر ہونے لگا۔ پھر اس چوٹی پر ٹنگی ہوئی تانبے کی گھنٹی جس کے بارے میں مشہور تھا کہ تین سو سالوں سے مخصوص وقت پر اُس کی مسحور کرنے والی آواز کانوں کو لبھاتی رہی ہے۔

پھر یہ بھی مشہور تھا کہ کبھی بھی کسی انگریز کا پاؤں اس خانقاہ کے اندر نہیں پڑا۔ آئرز اور گیلیان کا دل تھا کہ پتا کرنا چاہیے کیا یہ تینوں باتیں حقیقت بھی ہیں یا صرف فسانہ۔ سینٹ گونڈرو کی خانقاہ تک پہنچنے کے لیے انہیں دو دن لگ گئے اور وہ بھی دو گائیڈز کے ہمراہ۔ وہ ایک جمے ہوئے برف کے ٹیلے کی مانند تھی۔ جس کی چھت گویا برف میں مدفون تھی۔ وہاں دو ملازم معمور تھے تاکہ کبھی کبھار آنے والے کسی سیاح کی خدمت کی جا سکے۔ ان کا بھی بڑا پرتپاک استقبال کیا گیا۔ انہیں پینے کے لیے جو مشروب دیا گیا اُس نے دوبارہ ان کے رگ و پے میں زندگی دوڑا دی۔

انہوں نے وہاں ہمیشہ گونجتی ہوئی گھنٹی کی آواز محسوس کی۔ انہی مٹیالے پتھروں کی دیواروں کے پیچھے انہوں نے پھر وہی حکایت سنی کہ وہ پہلے انگریز ہیں جو اس خانقاہ میں داخل ہوئے ہیں۔ وہ حیران تھے کہ شاید یہ دنیا کی واحد جگہ ہے جہاں شاید وہ نہیں پہنچے۔ تین بجے تھے جب وہ دونوں یہاں پہنچے تھے اور اب پادری کرسٹوفر کے ساتھ ایک بہت بڑے اور ٹھنڈے خانقاہ کے کمرے میں کھڑے بھکشوؤں کی قطاروں کو کھانے کے کمرے میں جاتا دیکھ رہے تھے۔ وہ دو دو

کی قطاروں میں سر کو جھکائے مکمل خاموشی سے پیروں میں کھڑاوں کو پہنے کھردرے پتھروں پر سے چلتے ہوئے گزرتے جا رہے تھے۔ یہ قافلہ آہستگی سے رواں دواں تھا کہ اچانک آئرز نے گیلین کا ہاتھ تھام لیا اور سرگوشی کرتے ہوئے بولا ''دیکھو وہ اب بالکل تمہارے سامنے سے پیچھے..... وہ جس نے ہاتھ اپنے کولہے پر رکھا ہوا ہے۔ اگر وہ جونی بیل چیمبر نہیں ہے تو پھر ضرور میں اندھا ہوں اور مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔ گیلین نے دیکھا اور فوراً کبھی فیشن کے دیوتا کو پہچان لیا۔

وہ حیرانگی سے بولا ''کیا اتفاق ہے یہ محترم یہاں کیا کر رہے ہیں۔ مجھے ابھی بھی لگتا ہے کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ بیل چیمبر تو کبھی مذہبی نہیں تھا۔ ہوسکتا ہے کبھی اس نے کوئی دعائیہ کلمات ادا کیے ہوں جب اس سے ٹائی صحیح نہ باندھی جا رہی ہو۔'' آئرز بولا ''مجھے کوئی شک نہیں وہ بیل چیمبر ہی ہے۔ اُسے دیکھنے کے لیے مجھے دوربین کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن کہاں وہ دنیا جہان کے قیمتی لباس پہننے والا اور کہاں بھکشوؤں کے لبادے میں ملبوس اور وہ بھی اس ٹھنڈ میں، کمال ہے۔ میرا ذہن ابھی بھی اس بات کو قبول نہیں کر رہا۔ آؤ پادری کرسٹوفر سے پوچھیں وہی یہاں کا حال بتا سکتا ہے۔''

کرسٹوفر کو اُن کی درخواست پہنچائی گئی۔ تب تک سارے بھکشو کھانے کے کمرے میں جا چکے تھے۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کس بھکشو کا ذکر کر رہے ہیں ''بیل چیمبر'' کرسٹوفر بولا ''یہاں کے بھکشو اپنا دنیاوی نام فراموش کر دیتے ہیں۔ کیا آپ میں سے کوئی اس سے بات کرنا چاہے گا لیکن اس کے لیے آپ کو کھانے کے کمرے میں آ کر اسے پہچاننا ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ خانقاہ کی انتظامیہ کے سربراہ اس کی اجازت دے دیں گے۔''

آئرز اور گیلین کھانے کے کمرے میں گئے اور کرسٹوفر کو مطلوبہ شخص دکھایا۔ واقعی وہ بیل چیمبر ہی تھا۔ اب وہ اس کا چہرہ سامنے سے دیکھ سکتے تھے۔ وہ دوسرے بھکشوؤں کے ساتھ سر کو جھکائے بیٹھا تھا اُس کے ہاتھ میں روٹی تھی اور سامنے پڑے پیالے میں شوربہ۔

دونوں دوستوں کو اس بھکشو سے بات کرنے کی اجازت مل گئی۔ وہ ایک استقبالیہ میں کھڑے اب اُس کا انتظار کر رہے تھے۔ اس کی کھڑاؤں کی ٹھک ٹھک سے انہیں پتا لگا کہ وہ آ رہا ہے۔ آئرز اور گیلین ابھی بھی حیرت سے اس کا منہ تک رہے تھے۔ وہ ''وہی'' تھا لیکن اب اُس کی نظروں کے تیور بدل چکے تھے۔ اس کے تازہ شیو کیے ہوئے چہرے پر کمال کا سکون تھا۔ مکمل اطمینان تھا اور نروان ہی نروان تھا۔ وہ بالکل سیدھا کھڑا تھا اُس کی آنکھوں میں ہیرے کی انی جیسی چمک تھی۔

وہ نیویارک کے پرانے دنوں کی طرح آج بھی صاف ستھرا تھا لیکن اب وہ کسی سوٹ کے بجائے ایک ہی کپڑا تن پر اوڑھے ہوا تھا۔ ارغوانی رنگ کا ایک لمبا لبادہ۔ کمر کے گرد ایک رسی لپٹی ہوئی تھی۔ جس کی لمبی تنیاں گانٹھ کے بعد اُس کے پیروں کو چھو رہی تھیں۔ اُس نے پہلے سی گرم جوشی سے ہی دونوں سے مصافحہ کیا۔ وہی متانت اور وہی طور طریقہ۔ اگر اس ملاقات میں کہیں کوئی شرمندگی یا ہچکچاہٹ تھی تو وہ بیل چیمبر کی طرف سے نہیں تھی۔ کمرے میں بیٹھنے کی جگہ نہیں تھی۔ وہ کھڑے رہے۔ آئرز بولا آپ کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ یہاں آپ کے ملنے کی ہمیں ہرگز اُمید نہیں تھی لیکن پھر بھی ٹھیک ہے تمہارے لیے سارا شہر پریشان تھا۔ یہاں بھی ایک تصوراتی دنیا آنا اور حمد یہ گیت گانا ٹھیک ہے.....''

بیل چیمبر بولا ''یار چھوڑو بھی! ڈرو نہیں۔ مجھے بھی کوئی ڈر نہیں۔ میں فیصلہ کر چکا ہوں کہ باقی زندگی ان بھائیوں کے ساتھ ہی گزاروں گا اور یہی حقیقت ہے۔ مجھے یہاں امبروز کہتے ہیں اور مجھے تم سے ملاقات کے لیے دس منٹ دیے گئے ہیں۔ ارے تم نے جو کوٹ پہنے ہوئے ہیں وہ بالکل نئی طرز کے لباس ہیں۔ کیا آج کل براڈوے پر یہی فیشن مروّجہ ہے۔''

گیلیان بولا ''تم وہی پرانے چیمبر ہو۔ تم نے یہ سب کیوں کیا؟ کیا مصیبت آن پڑی تھی؟ اب شرافت سے یہ لبادہ اُتارو اور ہمارے ساتھ واپس چلو۔ سارا شہر تمہیں دیکھ کر خوشی سے پاگل ہو جائے گا۔ یہ تمہارا راستہ نہیں ہے۔ یقین کرو تمہارے آنے کے بعد کتنی لڑکیاں تمہیں یاد کرتے ہوئے تکیوں میں منہ چھپا کر روتی رہی ہیں۔ تمہیں یہاں کوئی درخواست دینی ہوگی یا کسی سے اجازت لینی ہوگی اور خدا کے واسطے تم نے جرابیں کیوں نہیں پہنیں؟''

بیل چیمبر نے سر جھکا کر کھڑاؤں کو دیکھا اور مسکرا دیا۔ وہ بولا ''میرے دوستو! تم نہیں سمجھو گے۔ تمہاری مہربانی ہے جو تم مجھے ساتھ لے کر جانا چاہتے ہو لیکن پرانی زندگی مجھے قبول نہیں کرے گی۔ میں جہاں پہنچ گیا ہوں وہی میری ساری خواہشوں کی منزل ہے۔ میں یہاں خوش بھی ہوں اور مطمئن بھی۔ میں نے باقی زندگی اب ادھر ہی گزارنی ہے۔ تم اس رسی کو دیکھ رہے ہو جو میں نے باندھ رکھی ہے۔'' پھر اس نے ہاتھ سے اپنے لبادے کو سہلایا اور بولا ''آخر میں نے وہ پہن لیا جو میرے ٹخنوں پر بھاری نہیں ہے۔ آخر میں نے حاصل کیا.....''

تبھی خانقاہ میں گھنٹی کی آواز گونج اُٹھی۔ لگتا تھا کہ عبادت کا وقت ہو گیا تھا۔ امبروز نے سر جھکایا۔ وہ مڑا اور ایک لفظ کہے بغیر کمرے سے نکل گیا۔ پتھروں کے پیچھے جاتے ہوئے انہیں لگا جیسے شاید ہاتھ ہلا کر اس نے انہیں الوداع کہا ہے۔ وہ خانقاہ سے واپس آئے وہ اسے دوبارہ نہیں مل سکے۔ یہ وہ کہانی تھی جو آئرز اور گیلین اپنے ساتھ لے کر واپس آئے۔ یورپ کی آوارہ گردی سے انہیں یہی ملا تھا۔

شاعری

تمغہ شہرت نہیں تو داغِ رُسوائی ملے
کچھ تو ان بے چین روحوں کو پذیرائی ملے
اے خدا! چھٹ جائے ذہنوں سے مسائل کا غبار
فکر کو تابندگی، جذبوں کو رعنائی ملے
دشمنوں کا ذکر کیا وہ تو اُڑاتے ہیں ہنسی
اب کے غم خواروں میں بھی اکثر تماشائی ملے
رہبروں کی مصلحت بنی ہے سنگِ راہ
کاش اب کوئی جنونی، کوئی سودائی ملے
پتھروں سے خیر مقدم کر رہے تھے کل جو لوگ
آج وہ بھی ہم کو پھولوں کے تمنائی ملے
پیار کے دو بول وہ ہم کو عطا کر دیں اگر
ان شکستہ حوصلوں کو کچھ توانائی ملے
زندگی کی بانجھ دھرتی میں کھلیں خوشیوں کے پھول
حبس کے جلتے ہوئے صحرا میں پروائی ملے
وادیٔ گل کے مسافر اتنے تن آساں نہ ہوں
کچھ تو کانٹوں کو خراجِ آبلہ پائی ملے
لطف تو جب ہے کہ ہر منظر نظر افروز ہو
ہے مزا، جب دید کے قابل تماشائی ملے
یہ مسلسل بے قراری، مار ڈالے گی جلالؔ
ختم ہو جائیں مصائب یا شکیبائی ملے

ڈاکٹر سیّد قاسم جلالؔ/ بہاولپور

کیسے رہتے مرے نقوشِ پا
میرا سارا سفر تھا پانی کا

اُس نے دیکھا نہ اک نظر بھی مجھے
لاتعلق بنا رہا ایسا
کوئی شکوہ نہیں کیا اُن سے
دل پہ جھیلا ہے ان کا ہر صدمہ
صبر کر کر کے، جبر سہہ سہہ کے
آ گیا زخم دل کو بہلانا
بات اُن کی میں ٹوکتا کیونکر
دل میں تھا اتنا احترام اُن کا
اُس کو اپنے جواز کے حق میں
مل نہ پائی ہماری کوئی خطا
ساتھ راشدؔ رہا وہ برسوں تک
درد کا آشنا نہ ہو پایا

ممتاز راشدؔ لاہوری

سوچتا ہوں کہ مری ذات کے اندر کیا ہے
کون سے نطق شرابات کے اندر کیا ہے
ان کے چہرے کے بنا کیا ہے سحر کی اوقات
ان کی زُلفوں کے سوارات کے اندر کیا ہے
کس لیے لیتی ہے ہر تھاپ پر ڈھولک ہچکی
شور نالوں کا یہ نغمات کے اندر کیا ہے
ایک سورج کو بجھانے پہ تلے ہیں جگنو
کیا خبر ان کے خیالات کے اندر کیا ہے
ایک بندے کو سرِ عرش بلایا رب نے
تا کہ وہ دیکھے سماوات کے اندر کیا ہے
ایک دولہا کے سبب سے تھی حسیں یہ بارات
ورنہ اس عالمِ بارات کے اندر کیا ہے
عشق والوں کے نشانات مٹانے کے سوا
حسن والوں کے کمالات کے اندر کیا ہے
بھید ابلیس پہ اس بات کا شیوہ نہ کھلا
پیکرِ خاک کے ذرّات کے اندر کیا ہے

شریف شیوہ/ لاہور

وہم ہوتے ہیں قیاس ہوتے ہیں
لوگ دنیا شناس ہوتے ہیں
جن کے چہروں پہ مسکراہٹ ہو
ان کو غم ہی تو راس ہوتے ہیں
عشق کرتے ہیں ایسے لوگوں سے
دور رہ کر بھی پاس ہوتے ہیں
میکدے کی ہر ایک ٹیبل پر
چند خالی گلاس ہوتے ہیں
عشق جنگل ہے اور رستوں میں
کتنے خوف و ہراس ہوتے ہیں
چھوڑ کر یوں پلیز مت جائیں
ہم بچھڑ کر اُداس ہوتے ہیں
ہم نے راشدیؔ ترین دیکھا ہے
لوگ آنکھوں کی پیاس ہوتے ہیں

راشد ترین

دوام

اُداس آنکھوں میں رت جگوں کے
گلاب لمحوں کا رنگ مہکا
رگوں میں ٹوٹے ہوئے خیالوں کی
کرچیوں نے دھمال ڈالی
نظر نظر سے وہ کرب انگیز رقص کرتے ببول کانٹے
لہو پہ رقصاں محبتوں کے سیال لمحے
تمہارے دامن پہ چاند سورج ستارے بن کر
دمک رہے تھے
خیالی چھت کے ویران کونوں میں دُبکی باتیں
اُداس درزوں سے جھانکتی ہیں
سیاہ آنکھوں میں رت جگوں کا دھمال جاری
کمال جاری، وصال جاری، وبال جاری
ہماری سوچوں پہ ہجر طاری، بہت ہی بھاری
بہت سے بندھن، اک آرزو سے بندھے پڑے ہیں
تمہارے لفظوں کے طاقچوں میں
بہت سے چہرے نقاب اوڑھے، حجاب اوڑھے پڑے
ہوئے ہیں
وجودِ وحشت کی زد پہ آئے سفاک لمحوں نے
خواب چھینے، حساب چھینے، سوال چھینے، جواب چھینے
ہم ایسے درویش
انہی سوالوں انہی حوالوں میں کھو چکے ہیں
اپنے ذہنوں کے ان برباد مرقدوں پر رو چکے ہیں
پتلیوں پر لہو سے لکھی سبھی عبارت
آنسوؤں سے دھو چکے ہیں
ہم ایسے درویش سو چکے ہیں
بس اپنا اپنا دوام کھو چکے ہیں

آسناتھ کنول/لاہور

ہاں! میں اک عورت ہوں

ہاں!
میں اک عورت ہی تو ہوں
جو جنم جنم سے جلتی ہے
پھر بھی ہنستی رہتی ہے
جنم پر میرے جب بے دردی سے رُلایا تھا
تب ماں میری نے لپک کر مجھ کو سینے سے لگایا تھا
بابا بھی تو چشم نم سے دھیرے سے مسکرایا تھا
وقت نے جیسے کروٹ بدلی
وصل کا موسم آیا تھا
لحہ لحہ بیل کی مانند کچے آنگن میں بڑھتی گئی
گڑیا، جھولا، کھلونے میرے
پل کے پل میں کھو سے گئے
آنکھ کے جھرنوں میں بہہ سے گئے
چھم چھم کرتے پازیبوں والے
جوانی کی دہلیز پر جب پیر پڑے
گیلی مٹی سے کھیلتا بچپن پیچھے کہیں چھوٹ گیا
بابل کے کچے آنگن کا جیسے
ہر اک حصہ مجھ سے روٹھ گیا
ہتھیلی پہ جونہی آنسو گرا
قدرت سے بس اتنا کہا
ہوتی ہیں جب پیدا بیٹیاں
تو کیوں سوال اُٹھتے ہیں؟؟
جواں ہوں تب بھی
اور بیاہی نہ جائیں تو بھی
کیوں سوال اُٹھتے ہیں
ننھے پیروں سے گرتے سنبھلتے
کچے صحن سے پکے مکاں میں بہانے سے بھی
کیوں سوال اُٹھتے ہیں؟
دیکھا ہے ماں!
سنبھال کے رکھنا چیزیں میری پرانی
میرا بچپن ٹوٹا کھلونا، اور گڑیا سہانی
یاد ہے وہ دن کو بابا گھوڑا بنے
اور رات کو سنی کہانی
بچپن بیتا سب کچھ چھوٹا سامنے تھی جوانی
یوں بہتی آنکھوں سے آہ چھپاتے
بابا نے ماتھے پہ اک بوسہ لیا
اجنبی کے ہاتھوں میں ہاتھ تھما کر
مجھ کو پرایا کر دیا
جس آنگن کا پھول تھی میں
اس آنگن سے جدا کیا

مسز فرزانہ شفیق برکت/کراچی

بہ یاد: سید قاسم محمود

بک ڈائجسٹ لاہور
Book Digest

ISSN 2079-4584
bookdigest@hotmail.com
kitabvirsa@gmail.com

مدیر اعلا: مظہر سلیم مجوکہ
مدیر اعزازی: اظہر سلیم مجوکہ

صوبہ پنجاب کے تمام کالجوں اور پبلک لائبریریوں کے لیے منظور شدہ

فروغ ادب کے لیے وقف

براہ کرم اپنی اردو اور انگریزی تخلیقات (شاعری ونثر) کمپوز کروا کے "ان پیج" میں ای میل کر دیا کریں
bookdigest@hotmail.com

آپ اپنے مضامین بذریعہ ڈاک بھی ارسال کر سکتے ہیں۔ رسالے کے حصول کے لیے سالانہ زرتعاون مبلغ -/1000 روپے اپنے ڈاک کے پتے اور موبائل نمبر کے ساتھ بذریعہ منی آرڈر بنام مظہر سلیم مجوکہ مدیر اعلیٰ ماہنامہ بک ڈائجسٹ، کتاب ورثہ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور کو ارسال کریں۔ رسالہ آپ کو باقاعدگی سے ملتا رہے گا۔

برائے خط کتابت/ ترسیل زر / رابطہ

بک ڈائجسٹ
کتاب ورثہ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور
0333-4377794-042-37322996

مختصر ادبی خبریں

✦ پاکستان کے معروف اور سینئر صحافی ادریس بختیار گزشتہ دنوں انتقال کر گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین

✦ شاعرہ فرحت پروین کے بہنوئی کا رحادثہ میں خالق حقیقی سے جاملے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین

✦ شاعرہ پروین نقش کے والد دارِ فانی چھوڑ کر خالق حقیقی سے جاملے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین

✦ شاعر سرفراز آرش کے والد انتقال کر گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین

✦ عظیم مصور جمیل نقش دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین

✦ شاعر طارق کریم کھوکھر کی والدہ گزشتہ دنوں انتقال کر گئیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین

✦ شعراء اقبال راہی اور ملک سلیم اختر ان دنوں علیل ہیں۔ دُعائے صحت کی درخواست ہے۔

✦ معروف ادیب محمد حامد سراج علیل ہیں۔ ادارہ ان کی صحت وسلامتی کے لیے دعا گو ہے۔

✦ اصغر ندیم سیّد کے اعزاز میں عطاء الحق قاسمی نے فلیٹیز ہوٹل میں شاندار تقریب کا انعقاد کیا جس میں ملک بھر سے نامور شعرائے کرام نے شرکت کی۔ تقریب کے اختتام پر افطار ڈنر کا پرتکلف اہتمام تھا۔

✦ گلشن ادب کا سالانہ مشاعرہ ہمدرد سنٹر کے ہال میں منعقد ہوا۔ پنجابی کے معروف ادیب عاشق رحیل کی سرپرستی میں یہ ادبی تنظیم گزشتہ 37 برس سے باقاعدگی سے مشاعروں کا اہتمام کر رہی ہے۔

✦ عالمی ادبی تنظیم ''ادارہ خیال وفن'' لاہور کے زیر اہتمام مشاعرہ ایمبیسڈر ہوٹل لاہور میں منعقد ہوا۔ ممتاز راشد لاہوری اس تنظیم کے سرپرست ہیں۔

✦ بزمِ چغتائی اور پلاک کے زیر اہتمام محمد عباس مرزا کے نعتیہ مجموعے ''آقا آقا'' کی تقریب پذیرائی پلاک میں منعقد ہوئی۔

✦ عالمی ادبی فلاحی وثقافتی تنظیم ''راستی'' کے زیر اہتمام عدل منہاس لاہوری کی نئی کتاب کی تقریب رونمائی اور مشاعرے کا اہتمام ادبی بیٹھک لاہور میں کیا گیا۔

✦ ماہنامہ ارژنگ کے مدیر اعلیٰ، شاعر، سفرنامہ نگار اور مترجم عامر بن علی عید کے موقع پر پاکستان میں مختصر قیام کے بعد جاپان واپس چلے گئے۔

✦ جرمنی میں مقیم ممتاز ادیب و شاعر اقبال حیدر پاکستان میں مختصر قیام کے بعد جرمنی واپس چلے گئے ہیں۔ یہاں قیام کے دوران ان کے اعزاز میں مختلف ادبی تنظیموں نے تقاریب کا اہتمام کیا۔

✦ لیجنڈری سنگیت سمراٹ واستاذ الاساتذہ ماسٹر فیروز الدین کی یاد میں جشن شامِ فیروزاں لاہور میں منعقد ہوئی۔

✦ معروف بلوچی شاعر اللہ بخش بزدار کے اعزاز میں ایک شام پلاک کے زیر اہتمام پنجابی کمپلیکس قذافی سٹڈیم لاہور میں منعقد ہوئی۔

✦ اسپین میں مقیم پنجابی کے معروف شاعر ارشد اعوان کا دوسرا پنجابی شعری مجموعہ ''بول فقیرا'' کے نام سے شائع ہوگیا ہے۔

✦ الطاف محمود قریشی کے کالموں کا پہلا مجموعہ ''نشاطِ ثانیہ'' کے نام سے چھپ کر مارکیٹ میں آ گیا ہے۔

✦ بہاولپور صادق پبلک سکول کی طالبہ ارمین امجد کا انگریزی ناول Scared Hearts کے نام سے شائع ہوگیا ہے۔ 350 صفحات پر مشتمل یہ ناول انہوں نے صرف 17 برس کی عمر میں تخلیق کیا ہے۔

✦ سرائیکی کے نامور شاعر صاحبزادہ ریاض احمد رحمانی کی کلیات ''میڈے لفظ آواز دے محتاج نئیں'' شائع ہوگئی ہے۔ کتاب میں بشریٰ رحمٰن، سلیم شہزاد، ڈاکٹر صغرا صدف کی آرا شامل ہیں۔

✦ مشاہیر کے تاریخی انٹرویوز پر مشتمل کتاب ''روبرو'' کے نام سے شائع ہوگئی ہے۔ یہ انٹرویوز مدیرانِ ''ارژنگ'' عامر بن علی، حسن عباسی اور لبنیٰ صفدر نے مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے نامور افراد سے کیے ہیں۔ انٹرویوز کے حوالے سے یہ کتاب اپنی نوعیت کی منفرد اور اہم کتاب ہے۔

تبصرۂ کتب

نام کتاب : یہ باتیں تیری یہ فسانے تیرے/انٹرویوز : بشریٰ رحمٰن/سنِ اشاعت : 2018ء/ قیمت : 2000روپے/تبصرہ نگار: حسن عباسی

ناشر : نستعلیق مطبوعات، فیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار، لاہور 0300 4489310

بشریٰ رحمٰن کا نام سیاسی، سماجی، ادبی اور صحافتی حوالے سے کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ادبی حوالے سے وہ اُردو زبان کی نہایت منفرد اور نامور ناول نگار، ہر دلعزیز افسانہ نویس، سفرنامہ نگار، ڈرامہ رائٹر، کالم نویس، شاعرہ اور شعلہ بیان خطیبہ ہیں۔ دنیا میں جہاں جہاں اردو کی بستیاں آباد ہیں وہاں وہاں بشریٰ رحمٰن کا نام اور تخلیقی کام پہنچ چکا ہے۔ اُن کے اب تک 9 ناول، آٹھ ناولٹ، چھ افسانوں کے مجموعے، آٹھ سفرنامے، تین فی البدیہہ تقاریر کی کتب اور چار کالموں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے تخلیقی کام کو ادبی اور عوامی حلقوں میں بھرپور پذیرائی ملی اور اُردو ادب کے نامور مشاہیر نے ان کے کام کو سراہا، بلکہ خوب صورت الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ بشریٰ رحمٰن نے 27 سے زائد ممالک میں پاکستان کی نمائندگی کی۔ زیرِ نظر مجموعہ ''یہ باتیں تیری یہ فسانے تیرے'' اُن کے قومی و بین الاقوامی انٹرویوز پر مشتمل ہے۔ اس حوالے سے وہ اُردو کی واحد ادیبہ ہیں جن کے انٹرویوز کتابی شکل میں شائع ہوئے ہیں ورنہ اس سے قبل مختلف شخصیات کے انٹرویوز پر مشتمل کتب شائع ہونے کی روایت رہی ہے۔ بشریٰ رحمٰن تین مرتبہ صوبائی اسمبلی پنجاب کی رُکن رہی ہیں۔ 1998ء میں صوبائی اسمبلی پنجاب کے صد سالہ اجلاس میں بشریٰ رحمٰن کی کارکردگی پر انہیں بہترین پارلیمنٹرین کا گولڈ میڈل دیا گیا۔ یہ گولڈ میڈل سابق وزیراعظم محمد خاں جونیجو نے دیا۔ 1990 میں صوبائی اسمبلی پنجاب نے انہیں ''بلبل پاکستان'' کے خطاب سے بھی نوازا۔ وہ 2002ء اور 2008ء میں قومی اسمبلی کی رکن منتخب ہوئیں۔ بشریٰ رحمٰن پاکستان کی پہلی کالم نگار خاتون ہونے کا اعزاز بھی رکھتی ہیں۔ پاکستان میں اُن کی تمام کتب Best Seller ہیں اور ہمسایہ ملک میں ان کی تمام کتب ہندی اور دوسری علاقائی زبانوں میں چھپ رہی ہیں اور کافی مقبول ہیں۔

بشریٰ رحمٰن کردار و گفتار کی غازیہ ہیں۔ اُن کی شخصیت اور تحریروں میں ایک خاص طرح کا تقدس اور نورانیت پائی جاتی ہے جو ہمیں صوفیا کے ہاں ملتی ہے۔ وہ ادبی دنیا میں ایک نیا موسم لے کر داخل ہوئیں اور رفتہ رفتہ ہم سب اس موسم میں رہنے لگے۔ خواتین کی دو نسلوں نے ان کی تحریریں پڑھ کر لکھنا سیکھا۔ انہوں نے اُردو ادب کی بہت سی اصناف کو گھر کی چیزوں کی طرح سنوارا اور نکھارا ہے۔ گھریلو زندگی ہو یا ادبی دنیا وہ دونوں میں سرخرو ہوئی ہیں۔ انہوں نے سلیقگی شائستگی، شگفتگی اور اپنی ہنرمندی سے ان دونوں انتہاؤں کو اعتبار بخشا ہے۔ چادر، چاردیواری اور چاندنی اُن کے کالم کا مستقل عنوان ہی نہیں بلکہ ان کی زندگی کا منشور بھی ہے جسے وہ دوپٹے کی طرح ہر وقت اپنے سر پر اوڑھے رکھتی ہیں۔ وہ زندگی کا گہرا شعور اور ادراک رکھتی ہیں۔ وہ زندگی اور ادب سے متعلق لگے بندھے اصولوں کو آنکھیں بند کر کے ماننے کی بجائے اپنی سوچ اور معیار کی کسوٹی پر پرکھ کے قبول یا رد کرتی ہیں۔ اس لیے وہ تحریر اور تجربہ ان کی ذات کی مکمل سچائی بن کر نمودار ہوتا ہے۔ ان کی کتابوں میں لفظوں کا خالص سونا بکھرا پڑا ہے جس میں ایک فیصد بھی کھوٹ شامل نہیں۔ اس لیے قاری نے ہمیشہ اُن کی ہر نئی کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیا ہے۔ اُمید ہے بشریٰ رحمٰن کے انٹرویوز کی یہ کتاب بھی غیر معمولی پذیرائی حاصل کرے گی۔ میرے ادارے کے لیے اس کی اشاعت اور اہتمام کسی اعزاز سے کم نہیں۔

نام کتاب : مجھ پر وجود آیا ہوا/شاعر: افضال نوید/سنِ اشاعت : 2018ء/ قیمت : 1200روپے

ناشر : بک ہوم، 56 مزنگ روڈ، لاہور

زیرِ نظر کتاب ''مجھ پر وجود آیا ہوا'' شاعر افضال نوید کا تازہ شعری مجموعہ ہے۔ شاعر علمی ادبی حلقوں میں اپنی پہچان رکھتے ہیں۔ اس کتاب سے پہلے ان کے پانچ شعری مجموعے ''تیرے شہرِ وصال میں''، ''افلاک لیے پھرتا ہوں''، ''آواز اُترتی ہے'' اور ''سمندر بات کرتا ہے''، ''دروازے تھے کچھ اور بھی'' شائع ہو کر قارئین سے پذیرائی حاصل کر چکے ہیں اور کئی زیرِ طبع ہیں۔

معروف شاعر نذیر قیصر کتاب کے دیباچہ میں لکھتے ہیں ''بڑا شاعر کون ہوتا ہے؟ جو ایک چھوٹے بچے کی طرح ٹہنی پر کھلتے پھول کو بھی چھو لیتا ہے اور موم بتی کی لَو کو بھی پکڑ لیتا ہے۔ روشنی کا یہ الاؤ اور رنگ و خوشبو کا یہی بہاؤ شاعری ہے۔ اس میں شاعر کہاں کھڑا ہے۔ یہ ہر شاعر نے خود فیصلہ کرنا ہوتا ہے ___ اور افضال نوید نے یہ فیصلہ کر لیا ہے اُس نے بچوں کی طرح دیکھنا، چھونا، چکھنا اور سننا سیکھ لیا ہے اور آسمان کی بادشاہی کا دروازہ بھی بچوں کے قدموں پر ہی کھلتا ہے ___ کائنات آزاد قدموں پر کھلتی ہے۔ بڑی بڑی باتوں سے بڑی شاعری نہیں بنتی، چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑی شاعری بنتی ہے۔ علم بھاری پتھر نہیں پھول کی پتی ہے ___ جو علم آدمی کو آزاد نہیں کرتا وہ گلے کا طوق اور پاؤں کی زنجیر ہے۔ افضال نوید کی شاعری ہمیں آزاد کرتی ہے کیونکہ اُس نے آزادی سے شاعری کی آسمان کے سامنے کھڑے ہو کر گہرا سانس لیا ہے۔''

ممتاز ادیب ناصر عباس نیئر کتاب کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں: ''افضال نوید مشکل پسند شاعر ہیں۔ اس کا اعتراف و اظہار ان کے پہلے پانچ مجموعوں پر لکھنے والے نقادوں نے کیا ہے۔ دو ایک نے اس مشکل کی وضاحت کی کوشش بھی کی ہے۔ ان کے مطابق افضال نوید کی غزل تجریدیت کی حامل ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ انھوں نے تجریدیت کو واضح کیا ہے نہ تجریدی آرٹ پر کچھ لکھا ہے اور نہ ہی اس امر پر روشنی ڈالی ہے کہ فن مصوری کے اہم اسلوب کے طور پر تجریدیت غزل کے اسلوب کا حصہ بن بھی سکتی ہے یا نہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ افضال نوید کے پہلے مجموعوں اور زیر نظر مجموعے ''مجھ پر وجود آیا ہوا'' کی غزلوں میں تجریدیت اپنے اصل مفہوم کے ساتھ موجود نہیں۔ تجریدی آرٹ حقیقت نگاری کی تحریک کے ردِ عمل میں وجود میں آیا۔ حقیقت نگاری کا موقف تھا کہ باہر کی دنیا میں موجود اشیا کی ہو بہو نقل کی جا سکتی ہے اور فنی نقطۂ نظر سے یہ ایک محمود عمل ہے۔ تجریدیت پسندی نے اس پر تنقید کرتے ہوئے یہ رائے قائم کی کہ ہم جس حقیقت کا ادراک کرتے ہیں۔ افضال نوید کی غزل مشکل سمجھی جا سکتی ہے مگر وہ تجریدی نہیں۔ اس بات کو بھی واضح کرنے کی ضرورت ہے کہ کسی متن کے مشکل یا آسان ہونے کا تعلق، خود متن سے زیادہ اس کی قرأت اور فہم سے ہے۔ یعنی متن مشکل یا آسان نہیں ہوتا اسے مشکل یا آسان سمجھا جاتا ہے۔ افضال نوید کی غزل معاصر غزل کے اس رجحان سے فاصلہ قائم کرتی ہے جسے نو کلاسیکی رجحان کا نام دیا جا سکتا ہے۔ افضال نوید غزل کی جدید شعریات کے اس اصول کو سرفہرست رکھتے ہیں کہ کسی لفظ، مصرعے، شعر پر کسی اور کا گماں نہ گزرے۔''

قاسم یعقوب افضال نوید کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں: ''افضال نوید نے ذات کے کشف کے بعد شعر کہے ہیں۔ ان کی غزلیں اپنے معاصر منظر نامے سے مختلف بھی ہیں اور نئی بھی۔ ذات کی 'میں' کا انکشاف اُن کے ہاں اسی انحراف و اختصاص کا نتیجہ ہے۔ افضال نوید کی غزلیں روایتی فریم سے باہر آ کر پڑھیے تو نئے نئے در وا کرتی نظر آتی ہیں۔''

شاعر انجم سلیمی افضال نوید کے بارے میں لکھتے ہیں ''افضال نوید محبتوں کا شاعر ہے۔ افضال نوید، غزل اور نظم ایک ساتھ لے کے چل رہا ہے اور وہ بھی بھرپور ایمانداری کے ساتھ۔ ورنہ ہجرت جانے کس کس سے اور کیا کیا چھین لیتی ہے شاید اس رائیگانی کو کوئی بھی نہیں جان سکتا سوائے اس فرد کے جس نے ہجر میں ہجرت کو بسر کیا ہو۔''

امید ہے شاعری سے دلچسپی رکھنے والے قارئین افضال نوید کی کتاب کو پذیرائی بخشیں گے اور یہ اردو شاعری میں ایک اچھا اضافہ ہے۔

اس کتاب کی اشاعت کا اہتمام بک ہوم کے چیئرمین رانا عبدالرحمٰن نے کیا ہے۔ ایم سرور نے معیاری پروڈکشن، دیدہ زیب سرورق اور اعلیٰ کاغذ پر شائع کی گئی ہے۔ کتاب مارکیٹ میں موجود ہے۔ براہ راست منگوانے کے لیے بک ہوم بک سٹریٹ 46- مزنگ روڈ لاہور (فون: 042-37231518) سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

یہ باتیں تیری یہ فسانے تیرے

بشریٰ رحمٰن کے انٹرویوز کا نیا مجموعہ شائع ہو گیا ہے۔

''وہ زندگی کا گہرا شعور اور ادراک رکھتی ہیں۔ وہ زندگی اور ادب سے متعلق لگے بندھے اصولوں کو آنکھیں بند کر کے ماننے کی بجائے اپنی سوچ اور معیار کی کسوٹی پر رکھ کے قبول یا رد کرتی ہیں..... اُمید ہے بشریٰ رحمٰن کے انٹرویوز کی یہ کتاب بھی غیر معمولی پذیرائی حاصل کرے گی۔ میرے ادارے کے لیے اس کی اشاعت اور اہتمام کسی اعزاز سے کم نہیں۔'' (حسن عباسی)

ناشر: نستعلیق مطبوعات

F-3 الفیر وز سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور 0300-4489310/0331-4489310

انٹرویو: سعید آسی

س اپنے علمی سفر کے بارے میں بتایئے۔

ج پاکپتن سے تعلق ہے اور پاکپتن کی فضا کافی علمی و ادبی ہے۔ میرے اپنے گھر کا ماحول والد صاحب کی وجہ سے علمی و ادبی رہا۔ انہوں نے گلستان و بوستان پڑھ رکھی تھی اور ان کا شعری ذوق بہت پائے کا تھا۔ ہمارے گھر میں بیٹھک ہوا کرتی تھی جہاں ادبی تقریبات منعقد ہوا کرتیں۔ اسی مناسبت سے میں نے اپنے کالمز کا عنوان بھی بیٹھک رکھا۔ پاکپتن کے مشہور رائٹرز یہاں جمع ہوتے۔ میرا اپنا میلان بھی ادبی تھا۔ اس وقت ٹی وی تو ہوتا نہیں تھا۔ ہمارے شہر میں بجلی بھی 65 کے بعد آئی تھی۔ والد صاحب نے گھر میں ٹرانزسسٹر رکھا ہوا تھا جس پہ سارا دن ہم گانے سنا کرتے۔ یہاں سے موسیقی کا شوق پیدا ہوا۔ اس کے علاوہ پرائمری کلاس سے ہی مجھے مصوری کا شوق بھی رہا۔ انہی تمام رجحانات کے ساتھ لکھنے کا رجحان بھی میرے اندر کہیں موجود تھا۔ کالج پہنچ کر کتابیں پڑھنے کا موقع میسر ہوا۔ ایک بار کالج میں میں نے اردو کا سارا پرچہ منظوم صورت میں حل کیا۔ یہ ایک طرح کا منفرد واقع تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ میں اس میں فیل ہو جاؤں گا لیکن میرے اُستاد نے میری بہت ستائش کی اور ساری کلاس کو دکھایا۔ کالج میں میں نے بھرپور ادبی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔ پنجابی ڈیبیٹ میں گولڈ میڈل لیا۔ گورنمنٹ کالج ساہیوال کی لائبریری میں پڑھنے کے وسیع مواقع میسر آئے۔ منٹو اور دیگر مصنفین کے مشہور افسانے میں نے اسی کالج کی لائبریری میں پڑھے۔ یہاں مجھے بھرپور مواقع میسر آئے۔ دلدار پرویز بھٹی صاحب ہمارے انگلش کے اُستاد تھے اور ان کی پہلی پوسٹنگ اسی کالج میں ہوئی تھی۔ تب جاوید قریشی ڈپٹی کمشنر تھے اور مجید امجد صاحب بھی موجود تھے۔ ان کے علاوہ مشاہیر سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا اور مجھے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ انہی دنوں میری پنجابی شاعری کی دھوم مچ چکی تھی۔ میرے ایک اُستاد نے میری حوصلہ شکنی کی جب میں نے اپنی شاعری سنائی تو کہا کہ آپ تو شاعر نہیں بن سکتے۔ تب انہوں نے مجھے چیلنج کیا کہ پنجابی میں شاعری کر کے دکھاؤ۔ اگلے دن میں نے پنجابی میں نظم لکھ کر سنائی جو زبانِ زدِ عام ہوگئی۔

س یعنی آپ نے شاعری کا آغاز پنجابی زبان سے کیا؟

ج نہیں آغاز تو خیر اُردو شاعری سے ہوا تھا۔ جیسا کہ میں نے بتایا کہ میرے اُستاد نے مجھے چیلنج دیا اور وہیں سے پنجابی اشعار کہنے کا سلسلہ چل نکلا۔

س صحافت کی طرف کیسے آنا ہوا؟

ج دراصل میرے والد صاحب تو مجھے وکیل بنانا چاہتے تھے۔ ان کی ڈیرہ داری تھی اور اس میں میرے لیے یہی پیشہ انہیں مناسب معلوم ہوتا تھا۔ انہوں نے اپنے کچھ دوستوں کے سامنے اس خواہش کا اظہار کیا۔ ان کی اسی خواہش کے احترام میں میں نے یونیورسٹی سے لاء کا امتحان پاس کیا اور کچھ عرصہ پریکٹس بھی کی لیکن یہ شعبہ دراصل میرا مزاج نہ تھا۔ یہ سب صرف والد صاحب کا شوق پورا کرنے کے لیے کیا۔ 1976ء میں میں نے لاء کر لیا تھا۔ ان کے ایک دوست نے یونیورسٹی میں خود میرا فارم فل کر کے جمع کروا دیا اور یوں میں لاسٹوڈنٹ بن گیا۔

س صحافت کی طرف لکھنے کی شوق کی وجہ سے آئے؟

ج ظاہر ہے لکھنے کا شوق تھا اور اسی شوق کی وجہ سے میں صحافت کی طرف نکل آیا۔ اصل میں میرے اندر کا رائٹر مجھے بے چین کیے ہوئے تھا کہ میں کسی ایسے فیلڈ میں آؤں جو ملازمت بھی ہو اور ساتھ ہی ساتھ اپنے شوق کو بھی پایہ تکمیل تک پہنچانے کا موقع مل سکے۔ سب سے پہلے میں ''وفاق'' میں آیا اور اسی دوران تحریک نظام مصطفےٰ کے سلسلہ میں گرفتار کر لیا گیا۔ پھر ''آزاد'' اخبار کو جوائن کر لیا۔ ساتھ میں ایک پرچہ سٹوڈنٹ نام کا تھا۔ میں اس کا بھی ایڈیٹر تھا۔ اس دوران روزانہ میرا کالم چھپا کرتا تھا۔ یوں تو میں نے سی ایس ایس کا امتحان بھی دیا لیکن میرا اپنا خیال ہے کہ جو عزت اور وقار اس شعبہ میں ہے وہ کسی اور میں نہیں ہے۔ لہٰذا اس شعبہ سے وابستگی جاری ہے۔

س گورنمنٹ کالج ساہیوال کی یادیں قارئین سے شیئر کیجیے؟

ج گورنمنٹ کالج ساہیوال میں گریجویشن کا دو سال کا عرصہ انتہائی بھرپور عرصہ رہا۔ بطور شاعر، ادیب، میری پہچان گورنمنٹ کالج ساہیوال ہی میں ہوئی۔ دسمبر ۷۱ء سے ۷۴ء تک کا یہ عرصہ وہ ہے جب مشرقی پاکستان ہم سے الگ ہو چکا تھا اور پاک بھارت جنگ کی تلخیاں اور یحییٰ خان کی رسوائیوں کے چرچے ماحول کو پراگندہ کیے رکھتے تھے۔ ساہیوال کی پرفضا ٹھنڈی سڑک بھی اُداس نظر آتی تھی۔ شعر و شاعری کے جذبوں کو جلا ملتی رہی۔ جاوید قریشی (جو چیف سیکرٹری پنجاب کے منصب سے ریٹائر ہوئے)

اس وقت ڈپٹی کمشنر ساہیوال ہوا کرتے تھے۔ باذوق آدمی تھے خود بھی شاعر تھے اس لیے ان کی زیر صدارت گورنمنٹ کالج ساہیوال میں اکثر ادبی تقریبات منعقد ہوتی رہتی تھیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے بڑے بھائی امجد علی آغا گورنمنٹ کالج ساہیوال کے پرنسپل تھے اور دلدار پرویز بھٹی کی بطور لیکچرار پہلی پوسٹنگ اسی کالج میں ہوئی۔ پروفیسر انوار الحق پروفیسر ریاض قریشی اور سب سے بڑھ کر سعادت سعید کے والد پروفیسر ڈاکٹر اے ڈی نسیم شعروادب کی محفلوں کی جان ہوا کرتے تھے۔ شیراز ہوٹل میں مجید امجد کے ساتھ نشستیں اور پھر ظفر اقبال اوکاڑوی، مشتاق صوفی اور جعفر شیرازی کے ساتھ خصوصی نشستیں زندگی کی یادوں کا سرمایہ ہیں۔ دلدار پرویز بھٹی انتہائی سادہ اور شستہ زبان میں انگریزی پڑھایا کرتے تھے۔ اپنے ناز وانداز کی وجہ سے دیکھتے ہی دیکھتے خاصے معروف ہو گئے۔ سکوٹر پر کالج آیا کرتے تھے۔ ایک بار ان کا تبادلہ کسی دوسرے سیکشن میں ہوگیا تو ہماری پوری کلاس نے ان کے حق میں پرنسپل آفس تک جلوس نکالا۔ چنانچہ انہیں واپس ہماری کلاس میں بلا لیا گیا۔ اس زمانے میں ہم پانچ چھ کلاس فیلوز علم وادب کے حوالے سے کالج کے باہر بھی اپنی شناخت پیدا کر چکے تھے۔ ان میں میرے علاوہ مظہر ترمذی، ریاض نغمی، جوزف سی لال، زاہد حسین رانا، رضا الحق صدیقی اور طاہر نسیم شامل تھے۔ مظہر ترمذی کلاسیکل شاعر تھے ان کا ایک شعر آج بھی ان کی یاد تازہ کرتا ہے۔

مجھے بھی شوق نے مہلت نہ دی ٹھہرنے کی
سفر پہ میں بھی روانہ ہوا کے بعد ہوا

مظہر ترمذی اب لندن میں جا آباد ہوئے ہیں۔

ریاض نغمی ساغر صدیقی کی ڈگر کے شاعر تھے۔ اُلجھے بکھرے بالوں اور ڈھیلے ڈھالے لباس کے ساتھ بالکل شاعر نظر آتے تھے۔ ان کا یہ شعر میرے ذہن کے پردے میں آج بھی محفوظ ہے۔

فلک کا رنگ ہے نیلا زمیں کی چوٹوں سے
چھپا کے دونوں کا غم چاند ہو گیا پیلا

س آپ نے روزنامہ وفاق سے صحافت کا آغاز کیا۔ اس بارے میں کچھ بتایئے۔

ج لاء کی تعلیم کے دوران روزنامہ ''وفاق'' سے صحافت کا باقاعدہ آغاز کر دیا۔ بھٹو دور تھا اور پنجاب میں حنیف رامے وزیر اعلیٰ تھے۔ ایک دن جمیل اطہر صاحب وزیر اعلیٰ کی پریس کانفرنس سے واپس آئے تو اے پی پی کی جاری کردہ حنیف رامے کی پریس کانفرنس کا ترجمہ مجھے ڈکٹیٹ کرانا شروع کر دیا۔ جتنی تیز رفتاری کے ساتھ انہوں نے ترجمہ کیا وہ صحافت میں پختگی کے لیے میرا پہلا تجربہ تھا۔ ارشاد حقانی اور بشیر احمد ارشد جو اس وقت لیل ونہار کے ایڈیٹر تھے اور شاہ دین بلڈنگ میں وفاق کے دفتر کے ساتھ ہی ان کا دفتر بھی ہوا کرتا تھا۔ وفاق کا اداریہ لکھتے تھے۔ مجھے ان دونوں سے ان کے اداریے کی ڈکٹیشن لینے کا شرف بھی حاصل ہوا۔ اس وقت نیوز ڈیسک پر منصور حیدر، صدیقی سبحانی، آفتاب عظیم، ایم ارشد اور کچھ عرصہ بعد انور طاہر، مقبول سعید، ایڈیٹوریل میں ایگزیکٹو ایڈیٹر جمیل اطہر، قربان انجم اور رپورٹنگ میں منیر کاظمی، آغا نعیم صادق، زاہد علی خاں، اعظم ناصر اور پھر مجاہد منصوری، وفاق کی میری اور رحمت علی رازی کی ہم سفری اُسی وقت سے جاری ہے۔ نوائے وقت میں بھی وہ ایک عرصہ میرے ہم سفر رہے۔ ہماری اتنی قربت رہی کہ آج بھی کبھی کبھی لوگ رازی کو آسی اور آسی کو رازی سمجھ لیتے ہیں۔

س نوائے وقت میں کس طرح آئے؟

ج نوائے وقت میں آنا کچھ اس طرح ہوا کہ ''آزاد'' جب بند ہوا تو میر خلیل الرحمٰن نے روزنامہ جنگ کے لیے مجھے لکھنے کو کہا۔ دراصل جنگ کی جو پہلی ٹیم تھی وہ ''وفاق'' سے اُٹھ کر ہی آئی تھی اور چونکہ میں بھی اس ٹیم میں شامل تھا۔ جنگ کی پہلی ڈمی ہم ہی نے بنائی لیکن میرا اس وقت بھی کریز تھا کہ میں نوائے وقت کے لیے کام کروں اور میں سوچتا تھا کہ اگر اس میں مجھے چانس مل جائے تو اسی پرچہ کو جوائن کر لوں گا اور اس سے بڑی بات میرے لیے اور کوئی نہیں تھی۔ لہٰذا میں نے وہاں بھی اپلائی کیا ہوا تھا کہ اچانک مجھے وہاں سے لیٹر آ گیا۔ میں خوشی سے نہال ہو گیا اور پھر میں نے کچھ نہیں سوچا۔

مجھے یاد ہے وہ 6 ستمبر 1981 کا دن تھا جب میں نے نوائے وقت کو جوائن کیا۔ اُس وقت سے آج تک میں نوائے وقت سے جڑا ہوا ہوں۔ نوائے وقت میں میں نے ہر طرح کا کام کیا۔ یہاں میری کوئی خواہش نہیں تھی۔ میں نے نظامی صاحب سے کہا تھا کہ جہاں آپ مجھے بہتر سمجھیں وہاں پر مجھے ایڈجسٹ کر دیں۔ سو میں شفٹ انچارج، بچوں کے ایڈیشن، نیز ادبی ایڈیشن کا انچارج بھی رہا۔ دیگر شعبہ جات میں بھی کام کرتے رہنے کے مواقع میسر آتے رہے۔

س آپ کی صحافت پر جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کے کیا اثرات مرتب ہوئے؟

ج ۱۹۷۷ء میں جنرل ضیاء الحق نے مارشل لاء لگایا تو ایئر مارشل اصغر خان نے اپنی پارٹی تحریک استقلال کو قومی سیاست میں اُجاگر کرنے کے لیے ایک ڈمی روزنامہ آزاد کو اپنی پارٹی کا ترجمان اخبار بنایا۔ چنانچہ آزاد ایک بار پھر پوری شان وشوکت، آب وتاب اور معروف صحافیوں کے جم غفیر کے ساتھ منظر عام پر آیا۔ جس کا ''مانو'' بھٹو کی کردار کشی رکھا گیا تھا۔ عباس اطہر صاحب اس اخبار کے ایڈیٹر تھے۔

مظفر الحسن نیوز ایڈیٹر، سہیل ظفر چیف رپورٹر، اظہر زمان، صادق جعفری شفٹ انچارج، میں پہلی بار بطور سٹاف رپورٹر اس اخبار کے ساتھ منسلک ہوا اور ہائی کورٹ رپورٹنگ میرے حصے میں آئی۔ کورٹ رپورٹنگ کا پہلا ہی تجربہ ہائی کورٹ کے فل بینچ میں زیر سماعت ذوالفقار علی بھٹو اور نواب محمد احمد خان قتل کیسے میں ان کے شریک ملزمان کے مقدمہ کی رپورٹنگ کی صورت میں حاصل ہوا۔ اس کے ساتھ ہی آزاد میں اپنا کالم ''سرگوشیاں'' بھی شروع کر دیا۔ یہ کالم ادارتی صفحہ پر عباس اطہر، سہیل ظفر اور آزاد کوثری کے کالموں کے ساتھ شائع ہوتا تھا اور عباس اطہر صاحب نے بطور خاص اس کالم کا مونوگرام ایک گنجے آدمی کی ٹنڈ کے اوپر بنوایا تھا۔ اخبار کا فرنٹ بیک میری خبروں کے ساتھ بھرا ہوتا اور ادارتی صفحے پر میرا کالم بھی موجود ہوتا۔ صحافت کرنے کا مزہ اس مختصر سے دور میں آیا۔

س مجید نظامی صاحب سے آپ کی ملاقاتیں رہیں اور ان کے قریب رہ کر ان کو جاننے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ وہ کیسی شخصیت تھے؟

ج میں نہیں سمجھتا کہ ایسی شاندار اور قابل شخصیت کے بارے میں ایک نشست میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ وہ نہایت رحم دل اور نہایت پیشہ ورانہ شخصیت تھے۔ انہوں نے پاکستان کی صحافت کی ہے۔ 1942ء میں خود قائداعظم نے انہیں آفر کی کہ کیا آپ ہمارے پریس کے لیے ملازمت کریں گے۔ اس وقت ایک پندرہ روزہ پرچہ چھپتا تھا جو تحریک پاکستان کا داعی تھا۔ وہ دن اور اس کے بعد کی تمام زندگی انہوں نے اسی مقصد کے لیے صحافت کرتے ہوئے وقف کر دی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میں جانبدار صحافی ہوں۔ اگرچہ کوئی اور اس طرح اپنے بارے میں کہے تو بڑا معیوب لگتا ہے لیکن وہ اپنے مقصد سے محبت کرتے تھے اور کہتے تھے کہ پاکستان کے خلاف نہ ہی کوئی بات سن سکتا ہوں اور نہ ہی برداشت کر سکتا ہوں۔ اس لیے ہم کہتے ہیں کہ نوائے وقت دراصل ایک نظریاتی اخبار ہے۔ یہ ایک اخبار ہی نہیں ایک پلیٹ فارم بھی ہے۔

جتوئی صاحب کی حکومت تھی۔ میں اس وقت رپورٹنگ کرتا تھا۔ اسمبلیوں کے ٹوٹنے کا معاملہ چل رہا تھا۔ میں نے اس بارے میں بھی لکھ دیا۔ نظامی صاحب نے مجھے بلا کر کہا کہ آپ صرف اتنا بتا دیں کہ جو رپورٹنگ آپ نے کی ہے کیا وہ سچ پر مبنی ہے۔ میں نے کہا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوگا کہ جس خبر کی سرخی چھ اخباروں نے لگائی ہے۔ وہ غلط کیسے ہو سکتی ہے۔ نظامی صاحب نے کہا ٹھیک ہے ہم فائٹ کریں گے اور میرے ساتھ اس مسئلے پر ڈٹ گئے۔ عدالت میں بھی پیش ہوئے۔ اگرچہ خوف کی ایسی فضا تھی کہ باقی سب کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ نظامی صاحب نے عدالت میں کہا پہلے آپ اپنا ساؤنڈ سسٹم تو ٹھیک کروائیں۔ خوف کی ایسی فضا میں میاں رفیق تارڑ چیف جسٹس تھے۔ مالکان اور دیگر کو توہین عدالت نوٹس جاری کر دیے گئے تھے۔ یہی وہ وقت تھا جب نظامی صاحب نے مجھ سے کہا کہ آپ مجھے حقائق بتا دیں کہیں کچھ غلط نہ ہو۔ میں نے یقین دلایا اور اوپر والا معاملہ اس کے بعد ہوا۔ تبھی انہوں نے کہا کہ آپ کے خراب ساؤنڈ سسٹم کی وجہ سے میرے پلے ایک بات بھی نہیں پڑی۔ آپ توہین عدالت کا نوٹس تو جاری کر رہے ہیں اور ساؤنڈ سسٹم آپ سے ٹھیک نہیں کروایا جاتا۔ عدالت میں سناٹا طاری ہو گیا۔ کھسر پھسر ہوتی رہی اور پھر چیف جسٹس سمیت سب اُٹھ کر چلے گئے۔ ایک گھنٹے میں اندر سے میسج آیا کہ کیس ختم ہو گیا اور سچ تو یہ ہے کہ میں نے اسی بات کو نبھایا۔ بہت آفرز ہوئیں لیکن اس پلیٹ فارم کو نہیں چھوڑا۔ یہی میری چوائس تھی اور یہی مجھے مل گئی۔

س بہت سے اخبار جاری ہوئے اور کچھ عرصہ بعد منظر سے غائب بھی ہو گئے۔ کیا وجہ ہے کہ نوائے وقت آج بھی اتنا ہی پاپولر ہے؟

ج اس کی ایک وجہ ہے اس نے اپنی Good Will اپنی وطن سے محبت اور پاسداری کی وجہ سے بنائی۔ پاکستان کے نظریات کی پاسداری ہی دراصل نوائے وقت کی پالیسی تھی اور آج تک اسی پالیسی پر پہلے دن کی طرح عمل درآمد ہوتا ہے۔ اس وفاداری کا دامن آج تک ہاتھ سے جانے نہیں دیا گیا۔ آج پاکستان میں جتنے بابے ہیں وہ شروع دن سے یہ اخبار پڑھ رہے ہیں۔ جتنے مرضی اخبار جاری ہو جائیں ان کی نوائے وقت سے محبت اور لگاؤ میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔

س اس فیلڈ میں کیا کامیابیاں اور ایوارڈ حاصل کیے؟

ج دیکھیے ایوارڈ کا مجھے کبھی اتنا لالچ نہیں رہا۔ ایوارڈ کمیٹی کی تشکیل ہونی چاہیے جو کہ سب لوگوں کے کام کا جائزہ لے کہ کس کا کام اچھا ہے اور وہ ایوارڈ کا حقدار ہے۔ لوگوں سے درخواستیں مانگی جاتی ہیں کہ آپ Entry دیں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے اس سے پہلے کبھی Apply نہیں کیا۔ بہرحال ہماری جو تنظیمیں ہیں میں ان کا کئی بار صدر رہا ہوں۔ لاہور پریس کلب کا دو بار سیکرٹری رہ چکا ہوں۔ اس کے علاوہ بھی کئی تنظیموں کی صدارت میرے پاس رہی۔ تو یہ عزت ہی میرا ایوارڈ ہے۔

س اتنی ٹف ڈیوٹی کے دوران شاعری یا دیگر تصانیف کے لیے وقت کیسے نکال لیتے ہیں؟ روز اداریہ کیسے لکھتے ہیں؟

ج مجھے یہ سب کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں

آتی۔ مجھے یہ سب اپنا روٹین ورک لگتا ہے۔ میں پچھلے بارہ سال سے روزانہ اداریہ لکھ رہا ہوں۔ کبھی ایک دن بھی میں نے محسوس نہیں کیا کہ مجھے یہ کام نہیں کرنا چاہیے۔ میرا پروفیشن ہی میرا شوق ہے۔ اب عمر کا تقاضا ہے کہ کچھ تھک جاتا ہوں۔

س شاعری، اداریہ، کالم کس صنف میں لکھنا پسند ہے؟

ج بنیادی میدان تو شاعری تھا۔ کہتے ہیں کہ یہ جرنلسٹ شاعر، ادیب تو نہیں ہوسکتا لیکن ہر شاعر ادیب جرنلسٹ ہوسکتا ہے۔ بڑے بڑے شاعر آج کالم نگاری کی طرف آچکے ہیں۔ شاعر و ادیب کے کالم لوگ زیادہ شوق سے پڑھتے ہیں۔ کیونکہ اس میں ایک ادبی رنگ بھی شامل ہوجاتا ہے لیکن دوسری طرف ایک پروفیشنل جرنلسٹ زیادہ تجزیے کے ساتھ لکھ سکتا ہے۔

س کیا الیکٹرانک میڈیا اخبار پر اثر انداز ہوا ہے؟

ج میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ آج چینلز کی بھرمار ہے۔ بولے ہوئے الفاظ تو ہوا میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ جبکہ لکھا ہوا لفظ اپنی توقیر رکھتا ہے۔ آپ جب چاہیں اسے دوبارہ پڑھ سکتے ہیں۔ اس لیے اخبار کی ویلیو کبھی ختم نہیں ہوسکتی۔ اب تو عدالتوں میں اخبار کے تراشے کو بطور شہادت تسلیم کیا جاتا ہے۔

س پرنیکٹ جرنلسٹس کے تحت صحافیوں کو درپیش خطرات میں پاکستان چوتھے نمبر پر ہے؟ اس کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

ج میں اس سے سو فیصد متفق ہوں۔ پاکستان میں شاید اس سے بھی زیادہ خطرات ہیں۔ جبکہ دیگر ممالک میں ایسا نہیں ہے۔ اگر خطرات ہیں تو تحفظات بھی بہت زیادہ ہیں۔ سہولیات بہت ہیں۔ کئی ممالک تو ایسے ہیں جو اپنے صحافی کو سٹوری نکالنے لیے جہاز تک مہیا کرتے ہیں۔ یہاں تو ان حالات کا عشر عشیر بھی نہیں ہے۔ صحافی کے کندھے پر رکھے کیمرہ کی تو انشورنس ہوتی ہے جبکہ صحافی کی نہیں۔ جتنا ٹارچر مجھے کیا گیا اس کا تصور بھی دوسرے ممالک میں نہیں ہے۔ یہ ایک جاب نہیں ایک مشن ہے۔ مادیت پرستی کی وجہ سے پروفیشنل صحافی بھی ختم ہوتے جارہے ہیں۔

س آپ اتنے طویل عرصہ سے نوائے وقت کے ساتھ وابستہ ہیں۔ کبھی خیال آیا کہ بس اب کافی ہو گیا، گھر تبدیل کرکے دیکھ لیا جائے۔

ج نہیں، ایسا خیال کبھی نہیں آیا۔ ایسا نہیں کہ میرے سامنے ترغیبات نہیں تھیں۔ بے پناہ چانس بھی ملے۔ اچھی اچھی آفرز بھی آئیں مگر میں نے اپنے لیے پیشہ صحافت میں جس منزل کا خواب دیکھا تھا وہ پورا ہونے کے بعد کسی دوسرے سہانے خواب میں کشش ہی نظر نہیں آئی۔ نوائے وقت میرا خواب تھا اور میں دیانت داری کے ساتھ سمجھتا تھا اب بھی سمجھتا ہوں کہ صرف نوائے وقت ہی وہ واحد اخبار ہے جس کی وجہ سے ہمارے ملک کی صحافت کا بھرم قائم ہے۔ یہ صرف اخبار نہیں، ایک تحریک بھی ہے۔ ملک کی نظریاتی اساس کی نگہداشت کی تحریک اس ملک کی تشکیل کا باعث بننے والے نظریات اور اصولوں پر کاربند رہنے اور حکمرانوں کو کاربند رکھنے کی تحریک، صحافت میں سچائی اور کردار کی پختگی کی تحریک اور سب سے بڑھ کر قومی درد کا احساس اور اس درد کے مداوا کے لیے اپنا قائدانہ کردار بروئے کار لانے میں نوائے وقت اور اس کے مدیر محترم مجید نظامی کی خدمات اس ملک اور قوم کے لیے ایک سرمائے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ مجید نظامی صاحب ہی ملک کی نظریاتی اساس کے پاسبان ہیں اور ملک کے صفحہ ہستی سے مٹانے کا خواب دیکھنے والی ہر قوت کے آگے ڈھال بن کر کھڑے ہیں۔ قومی تشخص اور وقار کے لیے کسی نقصان کی پرواہ کیے بغیر وہ کلمہ حق ادا کرتے ہیں تو ہمیں بھی حوصلہ ملتا ہے۔ اس لیے جتنی جرات اور بے باکی کے ساتھ میں نے نوائے وقت میں لکھا اپنے جذبات کا اظہار کیا شاید میں کسی دوسرے پلیٹ فارم پر ایسا کبھی نہ کرپاتا۔

س اپنی ذات کے حوالے سے اور کوئی خواہش، تمنا جو پوری نہ ہوئی ہو؟

ج میں ایک گناہ گار آدمی ہوں اپنے لیے خدا تعالیٰ سے صرف رحم کا طالب ہوں۔ عدل کا اس لیے تقاضہ نہیں کرتا کہ خدا تعالیٰ کی عدالت میں تو گندم کے ایک دانے پر بھی پکڑ ہوسکتی ہے اور خدا تعالیٰ نے خود بھی اپنے بندوں کے لیے رحم کا تقاضہ کرنے کی سب سے زیادہ سہولت رکھی ہے۔ ہم ہر وقت بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہتے ہیں تو درحقیقت خدا تعالیٰ کی رحمان اور رحیم کی صفت بیان کرتے ہوئے اپنے لیے رحم کا تقاضا ہی کرتے ہیں۔ بے شک عادت ہونا بھی خدا تعالیٰ کی صفات میں شامل ہے۔ مگر عدل میں سزا بھی ہوسکتی ہے اور جزا بھی جبکہ خدا تعالیٰ سے رحم کی بھیک مانگی جائے تو اس میں جزا ہی جزا ہے۔ اس لیے خدا تعالیٰ سے وہی لینے کی تمنا ہے جس کی خدا کے حضور بہتات ہے۔ یہ تمنا پوری ہو جائے تو دنیاوی زندگی میں کوئی دوسری تمنا دل میں تڑپ پیدا نہیں کرسکتی۔ میں نے اپنے ایک پنجابی قطعہ میں بھی یہی تمنا اس طرح کی ہے کہ

اوگن ہاریاں وچہ کی گن ہووے
دکھاں نال اے بھری حیات میری
رہا تیرے سہارے تے آن بیٹھاں
کریں رحم تے ہووے نجات میری

انٹرویو: اعتبار ساجد

اعتبار ساجد پاکستان کے نامور شاعر، ادیب اور دانشور ہیں۔ 60 سے زائد کتب نظم و نثر کے خالق ہیں۔ پیدائش اور ابتدائی تعلیم ملتان، بعدازاں بلوچستان، پھر اسلام آباد اور اب لاہور میں مقیم ہیں۔ تعلق سادات گھرانے سے ہے۔ انہوں نے خاصا نثری کام کیا لیکن شہرت شاعری سے پائی اور ایسی پائی کہ ساری اردو دنیا ان کی معترف ہوگئی۔ ان کی ایک ایک کتاب کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ بالخصوص ''مجھے کوئی شام ادھار دو'' کو اتنی پذیرائی حاصل ہوئی کہ پے در پے اس کے ایڈیشن دھڑا دھڑ شائع ہوتے گئے۔ حال ہی میں اس کتاب کا 18 واں ایڈیشن شائع ہوا ہے۔

ارژنگ: سب سے پہلے اپنے ادبی و سوانحی پس منظر سے آگاہی دیجیے۔

اعتبار ساجد: 1963ء کی دہائی میں باقاعدہ لکھنے اور چھپنے کا آغاز ملتان سے کیا۔ متعدد عمومی اور پاکستان کے مؤقر جریدے ''افکار، کراچی، نقاد، نقش اور عکس لطیف'' کراچی کے علاوہ ہفت روزہ ''قندیل'' لاہور میں بھی ہفتہ وار کالم ''چہرے'' کے عنوان سے لکھتے رہے۔ ملتان میں ہونے والے ان تمام کل پاکستان مشاعروں اور محافل میں شریک ہوئے جن میں برصغیر کے نامور شعرا اور ادباء شامل ہوتے تھے۔ مثلاً جوش ملیح آبادی، احسان دانش، فیض احمد فیض اور بے شمار ایسے نامور لوگ جو اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ تب فضا میں ایسی آلودگی، ایسی کثافت اور ایسی آپا دھاپی نہیں تھی۔ وہ زمانہ برق رفتار نہیں، آہستہ رو تھا لیکن برصغیر میں جتنے بڑے ادیب و شاعر پیدا ہوئے وہ 60,50 اور 70ء کی دہائی میں پیدا ہوئے۔ 80ء کی دہائی میں بھی یہ سلسلہ جیسے تیسے جاری رہا۔ البتہ 90ء کی دہائی کے بعد فضائی آلودگی بڑھنے لگی۔ جب کام کی جگہ نام کی خواہش پروان چڑھنے لگے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

ارژنگ: ادب سے شوق کی ابتدا؟

اعتبار ساجد: ادب سے شوق کی ابتدا تو اوائل عمری ہی میں ہو چکی تھی۔ بعد میں تو محنت اور ریاضت تھی یا ان بزرگوں کی صحبت جن سے بہت کچھ سیکھنے اور سمجھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ جوں جوں عمر آگے بڑھی مطالعے کے شوق میں بھی شدت پیدا ہوئی۔ اب تک ہم مطالعے کے بغیر سو نہیں سکتے۔ یہ ضرور ہوا ہے کہ موبائل مطالعے میں رخنہ انداز ہو گیا ہے۔ سوشل میڈیا ہم دیکھ رہے ہیں کہ رفتہ رفتہ پرنٹ میڈیا پر حاوی ہوتا جا رہا ہے۔

ارژنگ: اپنی تصانیف کے بارے بتائیے

اعتبار ساجد: تصانیف کی تعداد 60 سے زائد ہے۔ صرف ان کے نام لکھنے بیٹھیں گے تو پڑھنے والے بھی اُکتا کر یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ دفع کرو جی اتنی ڈھیر ساری کتابوں کے نام کون پڑھے اور کیوں پڑھے۔ ہوگا کوئی اعتبار ساجد تو ہوگا۔ ہم کیا کریں۔

ارژنگ: آپ نثر نگار بھی ہیں شاعر بھی، شاعری زیادہ مرغوب ہے یا نثر؟

اعتبار ساجد: ظاہر ہے اب شاعر کی حیثیت سے لوگ جاننے ماننے لگے ہیں تو شاعری بالخصوص غزل پہ ہی توجہ مرکوز رہتی ہے۔ نثر بھی لکھتے ہیں۔ متعدد اخبار و جرائد میں باقاعدگی سے کالم بھی شائع ہوتے ہیں لیکن دل ہے کہ غزل ہی کی طرف مائل رہتا ہے۔

بقول غالب:

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں

یہ واحد صنف سخن ہے جو فل ٹائم ورکر مانگتی ہے۔ پارٹ ٹائم وقت کے ساتھ ہی فنا ہو جاتے ہیں۔ ان کا رشتہ فن سے وقتی رشتہ ہوتا ہے۔ یہ بات سب کے لیے نہیں صرف ان کے لیے کہی ہے جو پارٹ ٹائم شاعر ہیں اور لطف یہ کہ فل ٹائم کی طرح اعزازات، انعامات اور بونس کے طلبگار رہتے ہیں۔

ارژنگ: لکھنے کی تحریک کہاں سے ملتی ہے؟

اعتبار ساجد: یہ تحریک اندر سے بھی ملتی ہے باہر سے بھی۔ جو شاعر یا ادیب خارجی عوامل کو سامنے رکھ کر وقتی، ہنگامی اور لمحاتی چیزیں لکھتے ہیں وہ خارجی مناظر کی تبدیلی کے ساتھ ہی منظر میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ اندرونی تحریک سے اُٹھنے والی کوئی موج سخن تلاطم بپا کر سکتی ہے۔

ارژنگ: تخلیقیت کیا ہے؟ ایک اچھے تخلیق کار سے آپ کیا مراد لیتے ہیں؟

اعتبار ساجد: ایک اچھا تخلیق کار ہم اسے سمجھتے ہیں جس کی تحریر آنکھ کے ذریعے دل میں اُترے اور تخت دل پر برسوں براجمان رہے۔ وقتی واہ واہ کوئی چیز نہیں نہ اس کا کوئی فائدہ ہے۔ نہ اس میں حقیقی تخلیق کار کے

لیے کوئی راحت ہے۔

ارژنگ: کوئی بے حد آسودہ وقت؟ تخلیقی سطح پر بھی اور زندگی کی سطح پر بھی۔

اعتبار ساجد: پتہ نہیں آسودگی سے آپ کی کیا مراد ہے۔ بہرحال ایک شعر سے شاید ہم اپنا موقف بیان کر سکیں۔

سورج ہے ظلمات کا قیدی، ہر تازہ زنجیر بہ پا ہے
ہم نے جب سے ہوش سنبھالا، ہم کو یہ ماحول ملا ہے

ارژنگ: مشاعروں پر جو زوال آیا ہے اس کا ذمہ دار کون ہے؟ آج کل مشاعروں کے نام پر جو کچھ پیش کیا جارہا ہے کیا آپ اس سے مطمئن ہیں؟

اعتبار ساجد: مشاعرے پہلے انسٹی ٹیوٹ ہوتے تھے۔ اب فیشن شوز یا گیٹ ٹوگیدر قسم کی چیز بن گئے ہیں۔ ایک دور ایسا بھی تھا کہ مشاعروں پر ٹکٹ لگتے تھے۔ لوگ ٹکٹ خریدتے تھے۔ کم پڑھے لکھے لوگوں کی بھی داد و تفریح نوٹنکی کے بعد مشاعرہ تھا۔ ''ارے جگر مراد آبادی آ رہا ہے۔ کھرید لے ٹکٹ۔ پھر اک گورکھپوری بھی آ رہا ہے۔ جوس ملیح آبادی بھی آ رہا ہے۔ اب یہ عالم ہے کہ اگر مشاعروں کے منتظمین نقد رقم دے کر بھی سامعین جمع کریں تو وہ ایک دو شاعروں کو سنتے ہی بگٹٹ بھاگ نکلتے ہیں۔ اب تو شعرائے کرام بھی اپنا کلام سناتے ہی بھاگ نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بہت کم ایسے لوگ رہ گئے ہیں جو دوست نوازی، گروہ بندی اور انتشار کے اس گرد و غبار سے زیادہ سے زیادہ دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہاں کوئی سنجیدہ محفل ہو تو اس میں جانے میں کوئی ہرج نہیں۔

ارژنگ: آپ ادب کے فروغ میں سوشل میڈیا کے کردار کو کیسے دیکھتے ہیں؟

اعتبار ساجد: اس سوال کا جواب تو غالباً ہم عرض کر چکے ہیں پھر بھی اعادہ کیے دیتے ہیں کہ سمندر میں طغیانی باہر سے نہیں اندر سے پیدا ہوتی ہے۔ زلزلے اندر سے اوپر آتے ہیں۔ اوپر سے واٹس ایپ وغیرہ پر خاموش تصویریں اور تحریریں ہوتی تھیں اب آندھی چلی ہے آڈیو ویڈیو اپ لوڈ کرنے کی۔ ہم جو شروع ہی سے لکھنے پڑھنے والے آدمی تھے اس آندھی کی زد میں آ گئے ہیں۔ سوچا ہے کہ اب ضروری آلات عکاسی کے ذریعے ان تک بھی اپنے کام کو تھوڑا بہت پہنچا سکیں جنہوں نے ہمیں دیکھا نہیں صرف پڑھا ہے۔ مراد شہرت نہیں فروغِ سخن ہے۔

ارژنگ: کیا کھویا کیا پایا؟

اعتبار ساجد: کیا کھویا؟ کیا پایا؟ الحمدللہ! آپ جیسے پیاروں کی محبتیں پائیں۔ چاہتوں کے پھول پائے۔ آٹھ نو سے زائد بی اے آنرز، ایم اے اور ایم فل کے مقالات ہمارے ناچیز تخلیقی کام پر لکھے گئے۔ مزید لکھے جا رہے ہیں۔ آدمی کو مختصر سی زندگی میں تھوڑی بہت پذیرائی مل جائے تو اسے خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے اور ہم یہی کرتے ہیں۔ البتہ یہ بھی کہنا بہت ضروری ہے کہ ہم اپنے رفتگاں اور اپنے موجودگاں کو کبھی فراموش نہیں کرتے۔ ان کی عزت کرتے ہیں۔ ان سے محبت کرتے ہیں۔ ہم نے 60ء کی دہائی سے اب تک ادب کے بہت سے ادوار دیکھے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند کے تقریباً تمام عظیم المرتبت شعراء، ادبا اور قائدین سے نہ صرف ملاقاتیں رہیں بلکہ ان کے تحریری توصیفی کلمات بھی نصیب ہوئے۔ آدمی کو اور کیا چاہیے؟

حسن عباس رضا / اسلام آباد

خیال و خواب سمجھ کر اُڑانے والا ہوں
میں اُس کی یاد کو اب پر لگانے والا ہوں
نہ اب وہ دل، نہ مرے کاغذات میں ہوگی
کہ اُس کا آخری خط بھی جلانے والا ہوں
اسی لیے تو زیادہ ہی چوڑ ہو گئی ہے
اُسے یقیں تھا میں وعدے نبھانے والا ہوں
وہ، جس نے سلطنتِ جاں میں ڈیرے ڈالے تھے
اُسے میں پتلی گلی سے بھگانے والا ہوں
اب اپنے آپ سے لینا ہے انتقام مجھے
سو، آئنے کے مقابل میں آنے والا ہوں
یقیناً اپنے ہی قدموں پہ اب گروں گا حسنؔ
کہ بائیں ایڑی پہ خود کو گھمانے والا ہوں

.....

چراغِ جاں بہت بھڑکے گا بجھنے سے ذرا پہلے
سو، تم بھی لوٹ جانا میرے کمرے سے ذرا پہلے
کہیں ایسا نہ ہو، تم چاند کی نظروں میں آ جاؤ
نکلنا شام کے پہلے ستارے سے ذرا پہلے
پھر اُس کے بعد تو اک موج مجھ کو لے گئی، ورنہ
عجب تھا خوف دریا میں اُترنے سے ذرا پہلے
تکلف برطرف، جب پیاس بھڑکے تو چلے آنا
میں دروازہ کھلا رکھوں گا پینے سے ذرا پہلے
کبھی ملنا جو چاہو تو پتہ آسان ہے میرا
بہت چھوٹا سا گھر ہے ایک بنگلے سے ذرا پہلے
میں تجھ تک نیند میں چلتے ہوئے آ جاؤں گا، لیکن
مجھے واقف تو ہو جانے دو رستے سے ذرا پہلے
یہ ممکن ہے کہ تم اُس بھیڑ میں پھر سے بھٹک جاؤ
سو، خود کو سونپ دینا مجھ کو، میلے سے ذرا پہلے
حسنؔ میں اس لیے گھوما تھا شب بھر بائیں ایڑی پر
کہ وہ تالی بجا دیتی تھی گرنے سے ذرا پہلے

نامہ ہائے احباب

محترم حسن عباسی صاحب!

السلام علیکم۔ اُمید ہے کہ مزاجِ گرامی بخیر ہوگا۔

اس سے قبل انگریزی کتاب تبصرے کے لیے بھیج چکا ہوں۔

اب دو غزلیں ارسال ہیں۔

خداوند تعالیٰ آپ کو حفظ و امان میں رکھے۔

آپ کا مخلص

قاسم جلال

جناب حسن عباسی صاحب!

آداب! اُمید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ بالآخر ''ارژنگ'' موصول ہوا۔ بہت شکریہ!! بطور خاص لبنیٰ صفدر کی ترقی کامیابی کا پڑھ کر سن کر بہت خوشی ہوئی۔ ''روبرو'' بھی بہت شاندار ہوگی جیسے کہ آپ لوگ ہیں۔ لبنیٰ کو میری طرف سے بہت مبارک باد۔ پیاری لڑکی کو خدا اور ترقی اور سرفرازی عطا کرے۔ آمین

عامر بن علی بہت کام کر رہے ہیں۔ میرا اسلام عرض کیجیے انہیں۔ ڈاکٹر شہناز مزمل اک بہت شاندار لکھاری اور پیاری شخصیت ہیں۔ اللہ انہیں سلامت رکھے۔ مضامین، افسانے، شاعری اپنی جگہ سب بہترین۔ لبنیٰ صفدر کا انٹرویو بھی بہت خوب!!

خط کی اشاعت کا شکریہ سلام۔ ہیں۔

آسناتھ کنول

محترم جناب عامر بن علی صاحب!

چیف ایڈیٹر ارژنگ لاہور

اسلام علیکم۔ آپ کے میگزین ''ارژنگ'' کے حوالے سے پہلی مرتبہ خط لکھ رہی ہوں۔ آپ مجھے نہیں جانتے مگر سابقہ ایڈیٹر اعزازی ابرار ندیم صاحب اور ریڈیو پاکستان لاڑکانہ کے سابقہ پروگرام پروڈیوسر اور میٹھی کے موجودہ اسٹیشن ڈائریکٹر محترم جناب سیّد عابد عباس کاظمی صاحب مجھے بہت اچھی طرح سے جانتے ہیں۔ کیونکہ میں لاڑکانہ ریڈیو پاکستان پر باحیثیت اردو کمپیئر پانچ سال کام کر چکی ہوں اور فطرتاً کچھ لکھنے لکھانے کا بھی ذوق رکھتی ہوں۔ آپ کے میگزین ارژنگ کے شمارے اکتوبر 2008ء میں میری ایک ادنیٰ غزل بھی شائع ہونے کا شرف حاصل کر چکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج پھر آپ کو اپنی ایک تحریر ارسال کرنے کی جسارت کر رہی ہوں جو کہ خواتین کے عالمی دن کی مناسبت سے ہے۔ اُمید ہے مایوس نہیں کریں گے۔ اگر قابلِ اشاعت ہوئی تو شکریہ کا موقعہ دیں گے۔

مسز فرزانہ شفیق برکت،

ڈرگ روڈ، کراچی

محترم جناب عامر بن علی صاحب مدیر اعلیٰ ماہنامہ ''ارژنگ'' السلام علیکم۔

مئی 2019ء کا شمارہ ماہنامہ ''ارژنگ'' ایک دوست کے گھر دیکھا تو اس کا ٹائٹل اتنا جاذب نظر تھا کہ بے اختیار اُٹھا لیا۔ فہرست پر نظر پڑی تو شاعری، مضامین، افسانے، سفرنامے اور انٹرویوز نے مطالعہ کے لیے دل بے چین کر دیا۔ سو دوست سے اُدھار مانگ کر لایا اور دو نشستوں میں پڑھ ڈالا۔ سبھی سلسلے بہت خوب تھے۔ سوچا خط لکھ کر آپ کو مبارک دوں کہ فی زمانہ ادبی رسالہ نکالنا اور لوگوں کے ادبی ذوق کی تربیت کرنا اور انہیں ادب مہیا کرنا کسی کارِ عظیم سے کم نہیں۔ آپ کی کامیابیوں کے لیے دعا گو

آغا تنویر

کراچی

جناب عامر بن علی/ جناب حسن عباسی!

اسلام علیکم۔ ماہنامہ ''ارژنگ'' کا طویل عرصہ سے قاری ہوں۔ اس کی باقاعدہ اشاعت ہی اس کے معیار اور ادب سے کمٹ منٹ کی ضمانت ہے۔ کاروباری مصروفیت کے باوجود ''ارژنگ'' کا انتظار رہتا ہے اور جب رسالہ ملتا ہے تو یوں لگتا ہے کوئی دیرینہ خواہش پوری ہوگئی ہو۔ ضیا پبلک لائبریری کے نام سے ہم نے حاصل پور میں ایک لائبریری بنائی ہوئی ہے جو کہ گزشتہ بیس برس سے تشنگانِ علم و ادب کی پیاس بجھا رہی ہے۔ کہنا یہ مقصود تھا:

''تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں''

''ارژنگ'' کی کامیابی اور ترقی کے لیے ہر وقت دُعا لب پر رہتی ہے۔

آفتاب، حاصل پور

صحافی کے کندھے پر رکھے کیمرہ کی تو انشورنس ہوتی ہے جبکہ صحافی کی نہیں

ایوارڈ کا مجھے کبھی لالچ نہیں رہا۔

نامور صحافی اور معروف ادیب

سعید آسی

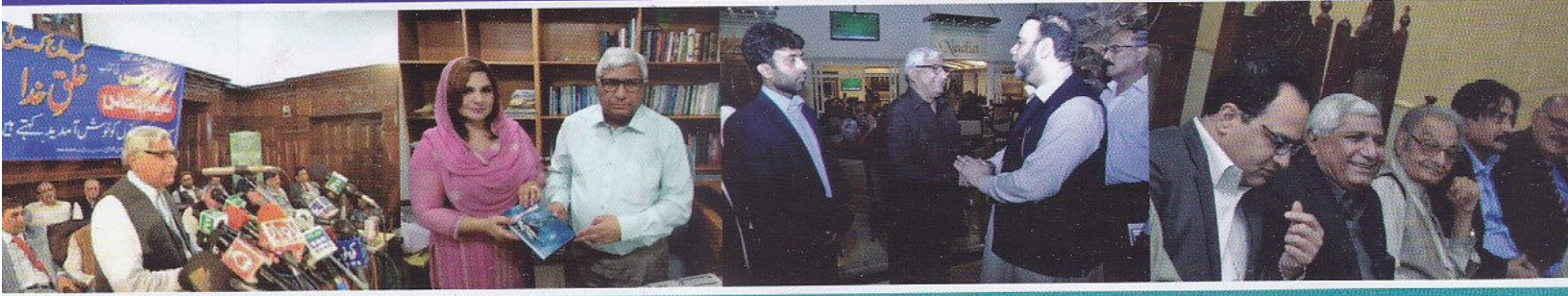


سے معروف شاعرہ اور کالم نویس

لبنیٰ صفدر کی گفتگو



نوائے وقت دراصل ایک نظریاتی اخبار ہے۔ یہ ایک اخبار ہی نہیں ایک پلیٹ فارم بھی ہے۔ مجید نظامی کہتے تھے کہ پاکستان کے خلاف نہ ہی کوئی بات سن سکتا ہوں اور نہ ہی برداشت کر سکتا ہوں۔



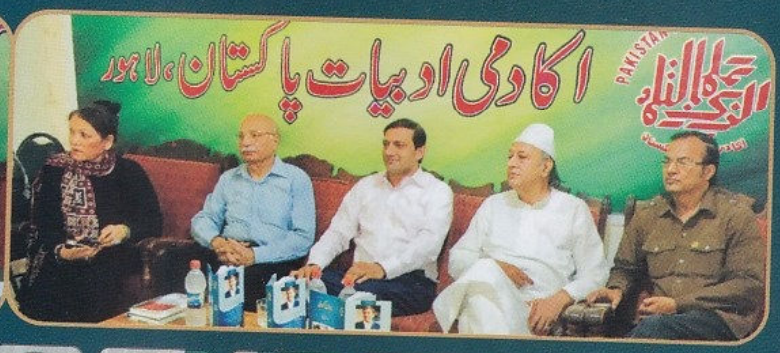
- اپنے علمی سفر کے بارے میں بتائیے۔
- پاکپتن سے تعلق ہے اور پاکپتن کی فضا کافی علمی و ادبی ہے۔ میرے اپنے گھر کا ماحول والد صاحب کی وجہ سے علمی و ادبی رہا۔ انہوں نے گلستان و بوستان پڑھ رکھی تھی اور ان کا شعری ذوق بہت پائے کا تھا۔ ہمارے گھر میں بیٹھک ہوا کرتی تھی جہاں ادبی تقریبات منعقد ہوا کرتیں۔ اسی مناسبت سے میں نے اپنے کالمز کا عنوان بھی بیٹھک رکھا۔ پاکپتن کے مشہور رائٹرز یہاں جمع ہوتے۔ میرا اپنا میلان بھی ادبی تھا۔ اس وقت ٹی وی تو ہوتا نہیں تھا۔ ہمارے شہر میں بجلی بھی 65 کے بعد آئی تھی۔ والد صاحب نے گھر میں ٹرانزسسٹر رکھا ہوا تھا جس پہ سارا دن ہم گانے سنا کرتے۔ یہاں سے موسیقی کا شوق پیدا ہوا۔ اس کے علاوہ پرائمری کلاس سے ہی مجھے مصوری کا شوق بھی رہا۔ انہی تمام رجحانات کے ساتھ لکھنے کا رجحان بھی میرے اندر کہیں موجود تھا۔ کالج پہنچ کر کتابیں پڑھنے کا موقع میسر ہوا۔ ایک بار کالج میں میں نے اردو کا سارا پرچہ منظوم صورت میں حل کیا۔ یہ ایک طرح کا منفرد واقعہ تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ میں اس میں فیل ہو جاؤں گا لیکن میرے اُستاد نے میری بہت ستائش کی اور ساری کلاس کو دکھایا۔

(مکمل انٹرویو اندرونی صفحات)

عالمی ادبی وثقافتی تنظیم ''راستی'' کے زیر اہتمام

معروف ادیب، صحافی اور شاعر **عامر بن علی** کے منفرد سفر نامہ **''جہاں گردی''** کی تقریب رونمائی







پاکستان کے نامور اہل قلم نے اظہار خیال کیا جن میں طاہر انور پاشا کے علاوہ ناصر بشیر، سعید جمال، اقبال راہی ڈاکٹر شاہدہ دلاور شاہ، زاہد حسن، راجا نیر، فاطمہ حیدر، ناصر محمود ملک، جاوید اقبال شیدا، ممتاز راشد لاہوری زبیدہ حیدر زیبی، فاخرہ انجم، عباس مرزا، زریں پنا، توقیر شریفی، فراست بخاری اور دیگر شامل تھے۔







عامر بن علی شرکاء سے پھول وصول کرتے ہوئے







نامور لکھاریوں اور دانشوروں کے کثیر تعداد میں شرکت فرمائی۔

Design By: 0300-4529821
MUHAMMAD AHSUN Gull

Read Arxang online
www.amirbinali.com
www.millat.com